اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی
ادب کے
معمار
باقی صدیقی
(حیات و خدمات)
11
تالیف، پروفیسر نجمی صدیقی

پاکستانی ادب کے معمار

باقی صدیقی

(حیات و خدمات)

تالیف :
پروفیسر نجمی صدیقی
نظر ثانی :
عزیز ملک

اکادمی ادبیات پاکستان ۔ اسلام آباد

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

"پاکستانی ادب کے معمار" اکادمی کا تازہ ترین ادبی و تحقیقی منصوبہ ہے۔ ادب کے معمار کی تعریف کے سلسلے میں اکادمی کو الجھن کا سامنا ہے۔ پاکستانی ادب نے ایک سے ایک ادبی نابغہ پیدا کیا ہے۔ ہر کسی نے اپنی اپنی صلاحیتوں اور میلان طبع کے مطابق پاکستانی ادب کے اس پر شکوہ ایوان کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ اکادمی ایسے تمام مقتدر' ممتاز اور رجحان ساز ادیبوں کی ادبی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی کہکشاں ہے کہ جس کا ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے۔

اکادمی ایسے تمام نامور ادیبوں' شاعروں' افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے' ایسی کتاب مونوگراف سے زیادہ اور تحقیقی مقالے سے کچھ کم ضخامت کی حامل ہو گی۔ ہماری کوشش ہے کہ ان کتابوں کی ضخامت' معیار اور مندرجات یکساں ہوں۔

معماران ادب کی تعریف کا مسئلہ اپنی جگہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان شخصیات کی ترجیحاتی فہرست مرتب کرنا بھی اتنا آسان نہیں۔ اس کتابی سلسلے کی آئندہ کتب کی اشاعت کیلئے ایک ترجیحاتی فہرست مرتب کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اکادمی کے مالی وسائل اتنی تعداد میں ساری کتابیں ایک ساتھ شائع کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس ترجیحاتی فہرست کے مطابق اس منصوبے کے تحت کتب کی اشاعت جاری رہے گی۔

ان معاملات میں آپ کو شریک کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اکادمی اور متعلقہ ادیبوں کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم رہے اور اکادمی کو اس منصوبے کا آپ کی رہنمائی میں از سرنو جائزہ لینے کیلئے وقت مل جائے گا۔

یہ بہرحال ایک اہم منصوبہ ہے اور اس کے جاری رہنے سے وہ مقاصد پورے ہوں گے جس کیلئے اکادمی قائم کی گئی تھی۔

اس منصوبے کے تحت جو کتابیں پہلے ہی طباعت کے مراحل سے گزر رہی تھیں ان میں سے ایک کتاب آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

خالد اقبال یاسر

باقی صدیقی

نام	محمد افضل
قوم	سہام قریشی
ولدیت	احمد جی
تاریخ پیدائش	اتوار 20 دسمبر 1908ء
تاریخ وفات	ہفتہ 8 جنوری 1972ء

مسجد الغفار سے متصل آبائی قبرستان سہام میں مدفون ہیں لوح مزار پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

دیوانہ اپنے آپ سے تھا بے خبر تو کیا
کانٹوں میں ایک راہ بنا کر چلا گیا

باقی ابھی یہ کون تھا موجِ صبا کے ساتھ
صحرا میں اک درخت لگا کر چلا گیا

ایک تاثر

ہوش آیا تو تاریکی میں تھے باقی
کتنی دیر چراغ جلا معلوم نہیں

باقی صدیقی نے 63 برس عمر پائی۔ اس عرصے میں انہوں نے معلمی، اداکاری، فوج کی کلرکی، فلمی مکالمہ نگاری اور گیت نگاری کرنے کے علاوہ ایک صحافی کی زندگی بسر کی۔

وہ تمام عمر مجرد رہے۔ ایک ذمہ دار انسان کی طرح جئے اور غیرت مند انسان کی طرح اپنی غیر آباد چھوٹی ہمشیرہ اصغری خانم کی خدمت کرتے کرتے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

انہوں نے زندگی کے سترہ سال ریڈیو کی ملازمت میں گزارے۔ جہاں انہوں نے پوٹھوہاری انگ میں گیت لکھے جو اب لوک ورثے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ان کے کچھ گیت بہت مشہور ہیں۔

سرگی ناویلا ہویا جاگ پیاں گلیاں کسے آس بلان پیاں اوٹھاں نیاں ٹلیاں
وگنا پیا سواں ڈھولا چھوڑ نہ دیویں بانہہ ڈھولا
اچے اچے بوٹیاں تے نی نی چھانی رات چنا ریشمی دوپٹہ پئی تانی

انہوں نے اردو، پوٹھوہاری فیچر، ڈرامے اور تقریریں لکھیں جس سے علاقے کی تہذیب تمدن اور ثقافت کو جلا ملی۔

باقی صدیقی نے اردو غزل اور پوٹھوہاری نظم کو وہ ذائقہ عطا کیا جسکے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔!

سوانحی خاکہ

ہم ذرے ہیں خاک رہگزر کے
دیکھو ہمیں بام سے اتر کے

باقی صدیقی کا اصل نام محمد افضل والد کا اسم گرامی احمد جی اور والدہ ماجدہ کا نام بی فضل جان تھا۔ انکے والد احمد جی ریلوے میں ملازم تھے۔ ریٹائر ہونے سے پہلے آخری دنوں میں گولڑہ سٹیشن پر سٹیشن ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ باقی صدیقی موضع سہام میں 20 دسمبر 1908ء کو پیدا ہوئے اور انتقال 8 جنوری 1972ء کو ہوا۔ سہام گاؤں جو شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ اس طرح مل چکا ہے کہ اسکی اپنی حیثیت ایک محلّہ کی سی ہو کر رہ گئی ہے' اس قدیم بستی کے اردگرد کی آبادیاں جو چھوٹی چھوٹی تھیں اور سہام کی ذیلی بستیوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ مثلاً" سہام گاؤں کے جنوب میں ایک بستی ڈھوک گجراں اب بھی اسی نام سے آباد ہے کو محکمہ مال کے کاغذات میں ڈھوک گجراں داخلی سہام لکھا جاتا تھا۔ اب یہ بستی سڑک کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے پہاڑ کے اوپر سے نشیب کی طرف لڑھکائے ہوئے برف کے گولے کی طرح جسامت میں بڑی ہو رہی ہے اور اسکے پھیلاؤ میں تیزی بھی آ رہی ہے۔ شہروں کے بڑھنے پھیلنے اور دیہات کے گھٹنے کا عمل اس قدر تیز ہو چکا ہے کہ سہام جیسی پرانی آبادیاں جہاں کہیں بھی ہیں صحرا میں گم شدہ حقیر ذروں کی سی نظر آتی ہیں۔

باقی صدیقی کا گاؤں' سہام انگریزی عمل دخل اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں قدم جمانے کے بہت پہلے سے آباد ہے۔ لفظ باقی کے ساتھ "صدیقی" کے لاحقے سے پہلا تاثر یہ ملتا ہے کہ "صدیقی" انکی قومیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر یہ حقیقت نہیں اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ وہ قومیت کے لحاظ سے "سہام قریشی" ہیں۔ جبکہ "باقی صدیقی" پورے کا پورا مرکب انکا قلمی نام ہے۔ صدیقی کا لاحقہ انہوں نے خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ سے قلبی تعلق کی بنا پر اختیار کیا تھا۔ سہام گاؤں جو باقی صدیقی کی جائے پیدائش بھی ہے۔ ان ہی کے بزرگوں نے بہت پہلے اپنی قومیت "سہام" کے نام پر آباد کیا تھا۔ گولڑہ شریف سے دھمیال گاؤں تک سہام قریشیوں کی جاگیر تھی۔ موضع نوتھیہ جو گولڑہ گاؤں کے متصل ہے سہام اور چک جلالدین میں اب بھی سہام قریشیوں کی آبائی زرعی جائیدادیں موجود ہیں۔

ضلع راولپنڈی کے گزیٹیئر 1907ء جلد اٹھائیس اے کے صفحہ باسٹھ پر یہ الفاظ درج ہیں۔

(The Siham Qurashis near Rawalpindi own a good deal of land which they are dissipating fast, the heads of the Siham Qurashis in Siham Rawalpindi are Jahandad Khan and Mian Muhammad Ji)

راولپنڈی کے نزدیک سہام قریشی آباد ہیں جو بہت سی زمین کے مالک ہیں جسے وہ بہت جلد شاہ خرچیوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ راولپنڈی میں سہام قریشیوں کے دو سردار ہیں۔ جہانداد خان اور میاں محمد جی۔ انگریزوں نے سہام قریشیوں کے شاہانہ رہن سہن اور طور طریقوں سے 1907ء ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ یہ جائیداد جو زرعی زمین کی صورت میں ان کے پاس ہے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی۔ اور گزیٹیئر میں یہ الفاظ بڑی سوچ سمجھ اور پیش بینی کے طور پر لکھ دیئے تھے کہ سہام قریشی اپنی زرعی زمینوں کو شاہ خرچیوں میں بے دریغ ضائع کر رہے ہیں۔ گزیٹیئر کی تحریر میں لفظ Dissipation کا یہی مفہوم ہے۔ بہرحال باقی صدیقی کو اپنے والد بزرگوار جناب احمد جی کی وفات کے بعد تین مواضع سہام تو تمیہ اور چک جلالدین میں زرعی زمین وراثت میں ملی تھی۔ انہوں نے اسے کبھی حصول رزق عزت اور وقار کا ذریعہ نہیں سمجھا۔ اور ضرورت پڑنے پر آہستہ آہستہ اپنے ہی عزیزوں رشتہ داروں اور مزارعین کے ہاتھ فروخت کرتے رہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ انکی وفات کے کچھ سال پہلے چند کنال زمین موضع چک جلالدین میں ابھی بچ رہی تھی۔ جو انکے بھانجے محمد اختر قریشی نے جو خود چک جلالدین ہی میں مقیم تھا۔ باقی صدیقی سے مختار نامہ عام لے کر فروخت کر دی۔ اس طرح اتنی بڑی جاگیر میں سے باقی کے پاس سہام میں صرف یک مکان باقی رہ گیا تھا۔ جس میں وہ اپنی چھوٹی بہن اصغری خانم کے ساتھ رہائش پذیر تھے یہ مکان دو کمروں اور کھلے صحن پر مشتمل تھا جو سہام گاؤں کی بڑی گلی "باقی صدیقی سٹریٹ" کے کنارے اب بھی موجود ہے۔ اور اس میں ان کی بھانجی رشیدہ بیگم اپنے خاوند قاضی نصیر اور بیٹے شاہد نصیر کے ساتھ آباد ہیں۔

باقی صدیقی نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا۔ انکی چار بہنیں تھیں جان بیگم پہلے فوت ہو گئی بڑی بہن کا نام شاہجہان تھا اور وہ قاضی عبدالحمید قریشی سے بیاہی گئیں۔ انکے بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ راولپنڈی میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی گاؤں کے بہت سے افراد اس موذی مرض میں مبتلا ہوئے باقی صدیقی کی ہمشیرہ کو بھی چیچک ہو گئی اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ دوسری بہن کا نام نور خانم

تھا جو میاں عزت بیگ قریشی کے عقد میں آئیں۔ نور خانم کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا' لڑکیاں رشیدہ بیگم اور محمودہ بیگم حیات ہیں اور صاحب اولاد بھی مگر لڑکا میاں محمد اختر قریشی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے اس کے بچے حیات ہیں۔ اختر قریشی میں کچھ علمی اور ادبی ذوق شوق تو تھا مگر وہ اس درجہ پر نہ پہنچ سکا جس پر اسکو پہنچنا چاہئے تھا۔ یا جسکی باقی صدیقی کو آس اور امید تھی۔ میاں محمد اختر قریشی نے باقی صدیقی کی وفات کے بعد باقی صدیقی اکیڈمی کے قیام کا اعلان کیا۔ کچھ تقریبات بھی منعقد کرائیں۔ جن میں جناب فتح محمد ملک' طفیل ہوشیار پوری اور احمد ندیم قاسمی جیسی مشہور و معروف شخصیات نے بھی شرکت کی۔ مگر یہ اکیڈمی کاغذی پیراہن سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ جسکے حوالے سے کبھی کبھار مقامی اخبارات میں اختر قریشی چیئرمین باقی صدیقی اکیڈمی کے کچھ ادبی اور کچھ سیاسی اعلانات یا بیانات شائع ہوتے رہتے تھے چھ اپریل 1993ء محمد اختر قریشی کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ بھی اختتام کو پہنچا۔

باقی صدیقی کی چھوٹی بہن کا نام اصغری خانم تھا۔ انکی شادی باقی صدیقی کے خالہ زاد قاضی عبدالعزیز سے ہوئی تھی۔ شادی ناکام رہی' طلاق ہوئی' اور اصغری خانم پھر باقی صدیقی کی کفالت میں آگئیں۔ آخری دم تک دونوں بہن بھائی آبائی مکان میں رہے انکا ساتھ بالکل ایسا ہی تھا جیسے انگریزی کے مشہور شاعر ورڈز ورتھ اور اسکی بہن ڈورو تھی کا تھا۔ اصغری خانم باقی صدیقی کی وفات کے بعد 31-7-1982 تک زندہ رہیں۔ باقی صدیقی نے آخری عمر میں اپنی بھانجی رشیدہ بیگم کے بیٹے شاہد نصیر کو گود لے کر پرورش شروع کر دی۔ اس بچے کا نام شاہد نصیر باقی صدیقی نے اپنے ایک عزیز دوست اور شاعر شاہد نصیر کے نام پر رکھا۔ شاہد نصیر واہ میں ملازمت کرتے تھے اور بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ خاص طور پر غزل اتنی خوب کہ باقی صدیقی شاہد نصیر کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ انکی ایک غزل کا مطلع مجھے پروفیسر جمیل ملک نے سنایا تھا۔

رات مہتاب دیکھتے گزری
زندگی خواب دیکھتے گزری

شاہد نصیر اردو کے مشہور نقاد اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت جناب عارف عبدالمتین کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ ایک دفعہ شاہد نصیر باقی صدیقی کو ملنے سہام تشریف لائے اور ایک رات یہاں قیام بھی کیا۔ وہ سگریٹ پیتے تھے دیے پر بگلے کی تصویر بنی ہوئی تھی وہ چین سموکر تھے۔ سانس پھولی رہتی چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھی رہتی تھی۔ سگریٹ اور چائے بار بار پیتے اور شعر کہتے تھے۔ باقی صدیقی کے ساتھ انکا کچھ ایسا جذباتی لگاؤ تھا کہ شاہد نصیر کا ذکر آتے ہی انکے تن بدن میں نئی زندگی اور چہرے پر تازگی نور بن کر جھلکنے لگتی تھی۔ جو بچہ باقی صدیقی نے

گویا اس کا نام بھی اسی جذباتی لگاؤ کی رعایت سے شاہد نصیر رکھا تھا۔

شاہد نصیر بچپن ہی سے ذہین اور خوبصورت تھا۔ ہر وقت باقی صدیقی کے ساتھ بستر میں اس طرح موجود رہتا جیسے آسٹریلیا کے کسی کنگرو کی تھیلی میں بچہ وہ جہاں جاتے اسے اپنے ساتھ رکھتے۔ باقی صدیقی کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنا ادبی کام بھی بستر ہی میں بیٹھ کر کرتے تھے۔ انہوں نے گھر میں لکھنے پڑھنے کے لئے کوئی علیحدہ اہتمام نہیں کر رکھا تھا۔ باقی صدیقی کی پرورش ہمہ وقت ساتھ اور لاڈ پیار اس بچے پر عجیب رنگ جمانے لگا۔ وہ خود سب سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے۔ یہ بچہ بھی آہستہ آہستہ باقی صدیقی ہی کی عادات اپنانے لگا۔ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا ہر وقت گھر کے اندر ہی رہتا۔ باہر نکلا بھی تو باقی صدیقی کے ساتھ ہی نکلتا۔ وہ انتہائی شرمیلا اور کم گو تھا۔ شاہد نصیر نے باقی صدیقی کو لکھتے دیکھ کر لکھنا شروع کر دیا انکی نقل میں کاغذ پر ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا۔ وہ اتنا خوش خط ہو گیا۔ کہ کم عمری ہی میں اسکے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزل اور باقی صدیقی کے ہاتھ کی غزل میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن بات مزاج کی ہوتی ہے شاہد نصیر کا مزاج ادب کے بجائے انجینئرنگ کی طرف زیادہ تھا وہ جلد ہی اپنے ہاتھ سے کاغذ' لکڑی اور ٹین کے کھلونے بنانے لگا۔ اسکے کھیلنے کی تمام چیزیں اسکے اپنے ہاتھ کی بنی ہوتی تھیں۔ اور وہ ان کھلونوں کے درمیان گھر ہی کے اندر زیادہ خوش رہتا تھا۔ باقی صدیقی کی وفات کے بعد اسکی تعلیم و تربیت کا سلسلہ اچانک رک گیا۔ اس نے مشکل سے میٹرک پاس کیا اور الیکٹرانکس کی مصنوعات کی مرمت اور تیاری میں لگ گیا۔ سہام گاؤں کے نزدیک ہی چوہڑ ہرپال میں پشاور روڈ پر بجلی کی مصنوعات اور الیکٹرانکس کی مرمت اور فروخت کا کاروبار شروع کیا اور بڑی کامیابی سے اسے چلا رہا ہے۔ وہ اسی مکان میں والدین کے ساتھ رہائش پذیر ہے جہاں باقی صدیقی اسے چھوڑ گئے تھے۔

باقی صدیقی کی اپنی تعلیم اور پرورش انکے ماموں قاضی چراغ دین کی نگرانی میں ہوئی مگر قاضی صاحب خود دھمیال گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ C.O.D میں ملازمت کرتے تھے اور وہیں سے ریٹائر بھی ہوئے۔ باقی صدیقی کے خالو قاضی عبدالمجید راولپنڈی صدر میں ڈینیز ہائی سکول میں مدرس تھے۔ اردو کے مشہور و معروف محقق ادیب اور صاحب طرز نثر نگار جناب عزیز ملک بھی ڈینیز ہائی سکول میں قاضی عبدالمجید کے شاگرد رہے ہیں۔ قاضی صاحب کو کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر سہام ہی کے کچھ اشخاص نے پشاور روڈ کے کنارے جہاں سے سہام گاؤں کی طرف کچا راستہ مڑتا تھا۔ قتل کر دیا۔ یہ غالباً" 1924ء کا واقعہ ہے۔ باقی صدیقی کے نانا قاضی فضل احمد بھی اسی سکول میں مدرس تھے۔ دھمیال گاؤں سے گھوڑی پر سوار ہو کر ڈینیز سکول میں روزانہ

پڑھانے آتے تھے۔ جناب عزیز ملک نے دونوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔

جب باقی صدیقی نے میٹرک پاس کیا تو وہ سہام گاؤں کے پہلے میٹرکولیٹ تھے۔ تعلیم کا رواج زیادہ نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لوگ بچوں کو سکول بھیجنے سے اس لئے گریز کرتے تھے کہ پڑھ لکھ کر وہ کھیت کھلیان میں والدین کا ہاتھ بٹانے سے جی چرائیں گے۔ اور والدین سمجھتے تھے کہ رزق روزی پیدا کرنا تعلیم سے زیادہ اہم ہے۔

نہ پڑھتے سو طرح کھاتے کما کر
وہ اور کھوئے گئے تعلیم پا کر
(اکبر آلہ آبادی)

انگریزوں کے زمانے میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی پیدائش کا تھانے میں اندراج علاقے کے نمبردار اور چوکیدار کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ اگر کوئی پیدائش تھانے میں درج ہونے سے رہ جاتی تو گاؤں کے نمبردار سے جواب طلبی کی جاتی تھی۔ بعض اوقات اس پاداش میں چوکیدار یا نمبردار پر جرمانہ بھی عائد کر دیا جاتا۔ زیادہ تر سکول ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت چلتے تھے۔ اور بورڈ کے افسران اور اہلکار متعلقہ تھانوں سے اس بات کا پتہ چلا لیا کرتے تھے کہ کون سے گاؤں میں کوئی بچہ پانچ سال کا ہو گیا ہے وہاں سے بچوں کی فہرستیں بنوا کر گاؤں گاؤں جا کر پولیس کے ذریعے والدین کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے سکول میں داخل کروائیں۔ مجھے یاد ہے دیہات میں رہنے والے لوگ بچوں کو سکول میں داخل کروانے کے بجائے ان کو چھپاتے پھرتے تھے۔ ایسے ماحول میں جو لڑکا میٹرک کر لیتا تھا اسے لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک سمجھا جانا لازمی امر تھا۔

باقی صدیقی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے ماموں قاضی چراغ دین کے ایما پر نارمل سکول گوجر خان میں داخلہ لیا اور وہاں سے جے وی کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ گوجر خان ہی میں ایک سکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔ اس طرح باقی صدیقی نے زندگی کی پہلی ملازمت ایک سکول ماسٹر کی حیثیت سے کی۔ راولپنڈی ڈسٹرکٹ میں کئی ایک سکولوں میں تقرر ہوا اور تعلیم و تدریس کے کام سے باقاعدہ منسلک رہے۔ مگر جلد ہی اس پیشے سے جی بھر گیا۔

انکے ماموں قاضی چراغ دین کو علم ہوا کہ باقی شعر کہنے لگا ہے تو انہوں نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ باقی کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ میرا یہ ادبی مشغلہ ماموں جان کو پسند نہیں۔ مگر سہام گاؤں کا ماحول اس وقت کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ لازمی طور پر باقی کی طبیعت نے اسکا شدید اثر قبول کیا۔ سہام گاؤں کے عین وسط میں ایک تالاب تھا۔ جس کے کنارے ایک بہت

پرانا بڑ کا درخت بھی، ساتھ ہی ایک کنواں جس کی گہرائی تقریباً ڈیڑھ سو فٹ تھی۔ لمبی رسی اور ڈول سے اس کنویں سے گاؤں کی عورتیں پانی کھینچا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی ایک پرانا قبرستان تھا۔ اس قبرستان میں ایک پرانا تکیہ جو چھوٹی اینٹوں کا بنا ہوا تھا جس کے آثار بوسیدہ حالت میں موجود ہیں۔ گاؤں کے بوڑھے جوان سبھی کام کاج سے فارغ ہو کر بڑ کے نیچے سستاتے یا سوتے تھے اور گپ شپ بھی لگاتے تھے۔ چاندنی راتوں کو اکثر قبرستان میں پرانے تکیے پر محفل جمتی تھی۔ جس میں سیف الملوک، ہیر وارث شاہ اور صوفیاء کا کلام سنایا جاتا تھا۔ اس تکیے خانے نے کچھ نوجوانوں کے دل میں شعر گوئی کی امنگ پیدا کر دی، افسوس اس بات کا ہے کہ ان میں سے اب کوئی بھی حیات نہیں۔ بہرحال ان کے اسمائے گرامی کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے۔ جن کی موجودگی وہ ادبی فضا تیار کر رہی تھی جس نے آخر کار باقی صدیقی جیسے عظیم شاعر کو جنم دیا ان مرحومین میں سرفہرست نام سائیں نظیر کا ہے جو برصغیر کے مشہور ہی کے رقاص سردار خان ساقی کے والد تھے۔ پنجابی زبان میں شعر کہتے تھے اور نہایت درد مند و حساس لطیف جذبات و احساسات رکھتے تھے۔ سائیں نظیر 1953ء میں حج بیت اللہ کیلئے تشریف لے گئے اور وہیں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس محفل میں ماسٹر نور محمد، میاں محمد گلستان خان ملک بھی شامل تھے۔ اب صرف نام باقی ہیں ان میں سے کسی کا نمونہ کلام دستیاب نہیں۔ ان میں ایک شخص شیر خان بھی تھے جو بلبل تخلص کرتے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ شیر خان بلبل دربار گولڑہ شریف سے بیعت تھے سہام ہی کے رہنے والے تھے اور حضرت مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اکثر گولڑہ شریف میں ہی قیام رہتا تھا۔ یہ سب حضرات سائیں احمد علی پشوری کے انداز میں چار بیت کہتے تھے اور آپس میں ہی سن سنا کر لطف اندوز ہوتے تھے بعد میں سب کے سب شعر گوئی چھوڑ کر کاروبار حیات میں گم ہو گئے۔ باقی صدیقی نے بھی ابتداء میں اسی ماحول کے زیر اثر پنجابی بیت ہی کہے۔ 1928ء میں غلام نبی کامل سے پنجابی اشعار کی اصلاح لیتے اور مشاعرے پڑھنے لگے تھے۔ سائیں کو احمد علی ایرانی بھی کہتے تھے۔ ایک زمانے میں واہ سواراں میں کئی جبنی طرز کے اردو پنجابی مشترکہ مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے باقی صدیقی سالہا سال ان مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ وہ اس زمانے میں افضل تخلص کرتے تھے۔ ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر باقی صدیقی خود بھی کیا کرتے تھے کہ چوہدری قمر میں کوئی شخص ایک مجمعے میں پوٹھوہاری بیت سنا رہا تھا۔ جب وہ چپ ہوا تو اس سے باقی صدیقی نے پوچھا کہ وہ کس شاعر کا کلام سنا رہا تھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ وہ ایک بہت پرانے مشہور

شاعر افضل کے اشعار گا رہا تھا۔ جبکہ وہ اشعار باقی صدیقی کے اپنے ہی تھے۔ شاید یہی واقعہ باقی صدیقی کے لا شعور میں تھا جب انہوں نے اردو کا یہ شعر لکھا تھا۔

تیرے افسانے سناتے ہیں مجھے
لوگ اب بھولتے جاتے ہیں مجھے

باقی صدیقی کا وہ کلام جو پوٹھوہاری بیتوں کی شکل میں تھا کہیں مربوط یا کتابی شکل میں تو دستیاب نہیں ہے۔ مگر انکے پوٹھوہاری بیت بعض پرانے لوگوں کو اب بھی یاد ہیں۔

م مرض محبت دا جوش دل وچ اے طبیب نہ دے دوا ہٹ جا
داروناں توں ساڑ نہ ہور سینہ اگے عشق نے دتا جلا ہٹ جا
میرے مرض دا دارو اوہ آپ کرسی جس نے لائی اے تیغ ادا ہٹ جا
بے رشک مسیحا دی اڑیک افضل بار بار نہ توں ستاہٹ جا

ایک اور چار بیتے کے صرف تین مصرعے دستیاب ہو سکے ہیں۔

حال خراب اے عاشقاں دا گلے طوق تے پیریں زنجیر رہندی
ہنجوں ڈھلدیاں رہن برسات واگوں رنگ زرد تے جان تطیر رہندی
صبح شام محبوب دی کراں' پوجا افضل سامنے اسدی تصویر رہندی

سکول کی ملازمت چھوڑنے کے بعد باقی صدیقی کے دل میں فلم اسٹار بننے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک روز راولپنڈی میں روز سینما کے سامنے سے گزرے۔ چند دوست انکے ہمراہ تھے۔ فلم "خیبر پاس" کے مشہور و معروف ہیرو گل حمید کی تصویر سینما کے سامنے آویزاں تھی۔ یہ تصویر دیکھ کر وہ دوستوں سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے۔ ایک دن میری تصویر بھی اسی جگہ سینما کے سامنے نمایاں طور پر لگی ہو گی۔ دوست اس دعوی کو ہنسی ہنسی میں ٹال گئے مگر باقی صدیقی ایک دن گھر سے غائب ہو کر بمبئی جا پہنچے۔ یہ واقع 1932ء کا ہے۔ باقی صدیقی نے امپیریل فلم کمپنی بمبئی میں شمولیت اختیار کی اور ایک فلم "توپ کا بچہ" میں باقی صدیقی کو تھانیدار کا رول مل گیا۔ یہ رول انہوں نے بڑی کامیابی سے نبھایا۔ فلم ریلیز ہوئی۔ راولپنڈی میں بھی دکھائی گئی۔ انہی کی پیش گوئی کے مطابق باقی صدیقی کی تصویر اسی چوکھٹے میں روز سینما کے سامنے آویزاں کی گئی گاؤں کے لوگ خاص طور پر باقی صدیقی کی تصویر دیکھنے کے لئے شہر گئے۔ بمبئی میں انہیں تین اور فلموں میں بھی جز وقتی کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک فلم کے گیت اور مکالمے بھی انہوں نے لکھے تھے۔ فلم کا نام تھا "مرد کا بچہ"

فلمی دنیا میں باقی صدیقی کی اس کامیابی کے کئی اور پہلو بھی ہونگے لیکن اس کا ایک رخ انکی ذات اور زندگی کے لئے شگون بد ثابت ہوا جس نے ان کی زندگی کی راہیں روک کر کچھ عزیزوں اور رشتہ داروں کی نظر میں انھیں بے وقعت کر دیا۔

شہر میں اس تصویر کی نمائش کے بعد باقی صدیقی کے لئے جہاں بھی رشتے کے لئے پیغام بھیجا گیا وہاں سے صاف جواب موصول ہوا۔ یہاں تک کہ باقی صدیقی کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے بھی انھیں داماد بنانے سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ انہوں نے بھانڈوں اور میراثیوں کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ باقی صدیقی 1932ء سے 1936ء تک بمبئی میں رہے۔ واپس آ کر 1940ء تک بے روز گاری کا مزہ چکھا

1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی باقی صدیقی 1940ء میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ انھیں حوالدار کلرک کے رینک میں لیا گیا تھا۔ انہوں نے وردی پہن لی۔ مگر سب رشتہ دار، عزیز اور ان کے دوست حیران تھے کہ باقی صدیقی وردی میں کیسے سمائیں گے۔ باقی صدیقی نے اپنے جسم کو سکیڑ کر فوجی وردی میں فٹ تو کر لیا مگر خود وردی پہننے کے باوجود پورے کے پورے وردی سے باہر رہ گئے۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب ان کی پوسٹنگ نوشہرہ چھاؤنی میں کر دی گئی۔ وہاں وہ دن آ گیا جب ان کو یہ حلف وفاداری اٹھانا تھا کہ وہ انگریز سرکار کے وفادار رہیں گے۔ باقی نے حلف لینے سے صاف انکار کر دیا جنگ کا زمانہ تھا۔ جرمنی انگریزوں کے وطن مالوف لندن پر تابڑ توڑ بمباری کر رہا تھا۔ ادھر باقی صدیقی نوشہرہ چھاؤنی میں حلف وفاداری لینے سے انکار۔ ان کے دوسرے ساتھی خوف زدہ تھے کہ باقی کو گولی سے اڑا دیا جائیگا۔ انھیں فوج کے سرداروں نے سمجھایا۔ ساتھی فوجیوں نے قائل کرنے کی کوشش کی مگر باقی صدیقی نے کسی کی کوئی بات نہ سنی۔ باقی صدیقی کو کوارٹر گارڈ کر دیا گیا۔ ایک اذیتناک قید تنہائی باقی صدیقی کا مقدر بنی رہی۔ ہر لمحہ موت کا خوف دروازے پر منڈلاتا رہتا تھا۔ اسی عالم میں ایک دن بڑے پراسرار طریقے سے انھیں کوارٹر گارڈ سے سخت پہرے میں نکالا گیا۔ کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیش ہوئی۔ وہ انگریز آفیسر تھا اس نے دھمکی آمیز لہجے میں باقی کو حلف لینے کی تلقین کی ورنہ سخت سزا کے لیے تیار رہنے کو کہا۔ انہوں نے جواب دیا میں باوجوہ انگریز سرکار کی نوکری تو کر سکتا ہوں مگر وفاداری کا حلف نہیں لے سکتا۔ میں مسلمان ہوں اور میری وفاداری میرے خالق اور ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیؐ اور ان کے پاک گھرانے کے علاوہ کسی اور کے لیے مخصوص نہیں۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ اب باقی زندہ نہیں بچے گا۔ کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیشی کے بعد باقی صدیقی کو پھر کوارٹر گارڈ کر کے سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ کچھ روز بند رہنے کے بعد ایک دن اچانک باقی

صدیقی کو خلاف توقع قید سے رہا اور ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ باقی صدیقی نوشہرہ چھاؤنی سے سہام واپس آ گئے۔

بے روز گاری کے جہنم میں جلنے کے ساتھ ساتھ تنگ دستی نے ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سخت پریشان حالی کے عالم میں باقی صدیقی نے C.O.D. میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے ملازمت قبول کر لی۔ مگر یہاں سے بھی ایک آفیسر کے ساتھ کسی بات پر الجھ کر استعفیٰ دے دیا۔ 1946ء میں وہ پھر ایم ای ایس کے دفتر میں ملازم ہو گئے تھے۔ جہاں 1949ء تک کام کرتے رہے۔ والدہ ماجدہ فضل جان کی وفات پر ایک مسلمان آفیسر نے انہیں چھٹی نہ دی تو اس ملازمت کو بھی خیرباد کہہ دیا۔

اس کے بعد باقی صدیقی نے جو ملازمت بھی اختیار کی عارضی طور پر کی۔ جہاں کہیں نوکری ملتی تھی وہاں سال بھر ملازمت کر لیتے تھے۔ کچھ رقم پس انداز کرنے کے بعد استعفیٰ تھما دیتے۔ نوکری کرنے کے دوران باقی صدیقی بیڑیاں پیتے تھے اور جب کچھ رقم جمع ہو جاتی تھی تو نوکری چھوڑ دیتے اور کیپسٹن کے سگریٹ پینے لگتے تھے۔ گویا بیڑی پینا باقی صدیقی کے برسر روز گار ہونے اور "Capstain یا Glod Leaf" کے سگریٹ پینا تنگ دستی اور بے روز گاری کی علامت تھا۔

ملازمت کی تلاش میں باقی صدیقی کئی مرتبہ پشاور بھی گئے۔ وہاں انہیں پشاور ریڈیو سٹیشن پر سٹاف آرٹسٹ کے طور پر رکھ لیا گیا۔ پشاور میں قیام کے دوران ان کے مراسم بہت سی ادبی شخصیات سے قائم ہوئے۔ محسن احسان' شوکت واسطی' احمد فراز' اور رضا ہمدانی وغیرہ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی مل کر ایک خوبصورت ادبی رسالہ سنگ میل کے نام سے نکالتے تھے۔

پشاور کے پشتو شاعر سمندر خان سمندر کو بہت سراہتے تھے۔ پشاور سے واپس آ کر اکثر انہیں یاد کیا کرتے تھے۔ شہروں میں پشاور شہر باقی صدیقی کو بہت عزیز تھا۔ اس شہر کی گلیوں سے باقی صدیقی کو گویا عشق سا ہو گیا تھا۔

1951ء میں راولپنڈی ریڈیو کے قائم ہونے پر باقی صدیقی نے پنڈی ریڈیو پر ملازمت اختیار کر لی اور آخر دم تک یہیں کام کرتے رہے۔ راولپنڈی ریڈیو کے قیام سے پہلے جناب ایوب محسن نے صرف اور صرف باقی صدیقی کو بے روز گاری کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے ایک رسالہ "راہ و منزل" کے نام سے بطور خاص جاری کیا۔ باقی صدیقی 1950ء سے 1952ء تک اس رسالے کی خدمت میں لگے رہے۔ "راہ و منزل" کا دفتر راولپنڈی میں مرکزی جامع مسجد کے

صدر دروازے کے پاس دوسری منزل پر واقع تھا۔ اس سے پہلے یہ دفتر شاہ نذر کے پل کے پاس ہوا کرتا تھا۔ جناب ایوب محسن ٹرانسپورٹر تھے وہ پنڈی مری ٹرانسپورٹ چلاتے تھے جس کا دفتر راجہ بازار کے عین وسط میں تھا۔ بہر حال ریڈیو پاکستان راولپنڈی وہ واحد محکمہ ہے جس میں باقی صدیقی نے پورے انہماک کے ساتھ کام کیا اور زندگی کے قیمتی سترہ سال اس ادارے کی نذر کر دیئے۔

پشاور شہر میں ملازمت کے دوران شہری سہولتوں نے باقی صدیقی کو ان کا کچھ کچھ عادی بنا دیا تھا۔ سہام گاؤں میں بجلی تھی نہ پانی۔ صرف ایک کنواں تھا جس سے گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کی ضرورت کے لئے گھڑوں میں پانی سروں پر اٹھا کر لاتی تھیں۔ ڈول اور رسی کی مدد سے چار چار پانچ پانچ مل کر رسی کو کھینچتی تھیں۔ گاؤں میں کچھ ایسے ماشکی بھی ہوا کرتے تھے جو اجرت پر پانی بھرتے تھے۔ لالٹین کے علاوہ اور کوئی روشنی کا انتظام نہ تھا۔

باقی صدیقی کو اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی برادری میں مسلسل کچھ واقعات کے رونما ہونے سے، جن میں ان کی چھوٹی بہن اصغری خانم کی طلاق کا واقعہ بھی شامل ہے، نفرت سی ہو گئی تھی۔ ریڈیو سٹیشن راولپنڈی پشاور روڈ پر واقع تھا جس کا سہام گاؤں سے فاصلہ تقریباً دو میل کا تھا۔ مگر یہ مسافت اس طرح اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ گاؤں سے پشاور روڈ تک تین فرلانگ کا کچا راستہ تھا جس میں ہر وقت گرد اڑتی رہتی تھی اور بارش کی صورت میں تو کیچڑ کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سڑک تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ مسلسل اس عذاب کے علاوہ گلی میں راہ چلتے باقی صدیقی کو کچھ ایسے چہرے بھی نظر آ جاتے تھے جن پر وہ تھوکنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ مزاجاً وہ جس شخص سے محبت نہیں کرتے تھے اس کی عزت بھی نہیں کرتے تھے۔ اس جذباتی اور نفسیاتی ہیجان کے نتیجے میں وہ اپنا آبائی مکان ہونے کے باوجود چوہڑ ہڑپال میں کرائے کے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ یہاں لب سڑک اس مکان میں باقی صدیقی کو یہ سہولت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ سائیکل پر سوار ہو کر ریڈیو پاکستان آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ اور یہاں انہیں پانی بجلی کی سہولیات بھی حاصل تھیں۔ یہ مکان چوہڑ چوک کے پاس یہاں کے قریشی حضرات کی ملکیت تھا جو باقی صدیقی کی قدر کرتے تھے پڑھے لکھے لوگ تھے اور انہیں ہر طرح عزیز رکھتے تھے۔ باقی صدیقی کو یہاں گھر سے زیادہ جسمانی اور ذہنی آرام تھا۔ نہ یہاں کسی کا آنا تھا نہ جانا سہام گاؤں میں اپنے گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر اصغری خانم شاہد نصیر اور باقی تین افراد کا یہ خاندان بڑے اطمینان اور سکون میں تھا۔ اس انداز سے باقی صدیقی نے ایک عرصہ گزار دیا۔

اس دوران سہام گاؤں کو بابو شفقت قریشی کی سماجی فلاحی کاوشوں کے نتیجہ میں گیس، بجلی

اور پانی کا کنکشن مل گیا۔ گاؤں روشن ہو گیا اور پانی جیسی بنیادی ضرورت بھی میسر آ گئی۔ مگر باقی صدیقی کو کبھی گاؤں میں آباد ہونے کا خیال نہ آیا۔ ان کا آبائی مکان غیر آباد رہنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ چھت ٹپکنے لگی تھی اور شہتیروں کو دیمک نے چاٹ لیا۔ ایک دن کوئی دیوار گری تو دوسرے دن ایک طرف سے چھت بیٹھ گئی۔ باقی صدیقی کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے رشتہ دار مکان ہتھیا لیں گے۔ انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ میرے قرابت دار میرے مکان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اور انتظار میں ہیں۔ کہ باقی مرے اور ہم اس کی متروکہ جائیداد پر قابض ہو جائیں۔ انہوں نے بار ہا یہ بات بڑے راز دارانہ انداز میں بتائی تھی۔

ایک عرصے کے بعد باقی صدیقی کے دل میں اچانک آبائی مکان کو مرمت کرانے کا خیال پیدا ہوا وہ اس وقت چوہڑ ہرپال میں رہائش پذیر تھے۔ ان دنوں ہی کے مشہور رقاص سردار خان کے ساتھ باقی صدیقی کے مراسم اور دوستی پہلے سے کچھ اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ اکثر سردار خان کو ایک جملہ بے اختیار کہا کرتے تھے۔ "سردار جب محبت زیادہ بڑھ جائے تو جدائی کہیں قریب ہی کھڑی ہوتی ہے" سردار خان سمای کو ریڈیو پر باقی صدیقی نے ہی متعارف کرایا تھا۔ اسے لازمی تربیت اور ہدایات دے کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ہی جیسے علاقائی رقص کو عوامی اور حکومتی سطح کی تقریبات میں بھی کامیابی کے ساتھ پیش کر سکے۔ باقی صدیقی کو خود کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اس قریبی دوستانہ تعلق کی وجہ سے انہوں نے سردار خان کو اپنے مکان کی مرمت کے لئے کہا۔ سردار خان نے یہ ذمہ داری قبول کرلی اور جلد ہی مکان کی مرمت کا کام شروع ہوگیا۔ مکان مرمت ہو رہا تھا مگر باقی صدیقی کے دل میں ایک انجانا خوف انہیں ہر وقت بے چین رکھتا تھا۔ ان دنوں ایوب خان کا مارشل لاء جاری تھا۔ جگہ جگہ باقی صدیقی یہ کہتے پھرتے تھے۔ خدا جانے میں یہ مکان کیوں مرمت کرا رہا ہوں۔ نہ جانے اس میں کیا مصلحت ہے اور قدرت کا کیا راز ہے۔ مجھ سے ذکر کیا تو میں نے انہیں جواب دیا کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ شاید اس بوسیدہ مکان کی فریاد بھی سن لی گئی ہے۔ اور اللہ پاک نے اسکی صحت اور تندرستی کا انتظام کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ قادر مطلق ان ہاتھوں سے اسکی مرمت کرا رہا ہے جو ایک پتھر پر دوسرا پتھر بھی رکھنے کے روا دار نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی صدیقی اور تعمیرات دو بالکل متضاد چیزیں ہیں۔

بہر حال باقی صدیقی کا آبائی مکان مرمت ہوگیا اسکے ساتھ غسل خانہ اور مہمان خانہ کا اضافہ بھی ہوگیا۔ پانی اور بجلی کی بنیادی ضرورت بھی میسر آگئی تو باقی صدیقی چوہڑ ہرپال میں کرائے کا

مکان چھوڑ کر واپس سہام اٹھ آئے۔ اس زمانے میں انہیں مذہبی کتابیں پڑھنے کا ایسا شوق ہوگیا تھا کہ ہر قسم کی مذہبی اور دینی کتابیں پڑھنے میں لگے رہتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے تو وہ شروع ہی سے پابند تھے۔ پنج گانہ نماز تو اپنی جگہ انہوں نے تہجد تک کبھی قضا نہیں کی تھی۔ اب تک ہر مکتبہ فکر سے استفادہ کر چکے تھے۔ پیری مریدی سے لے کر چلہ کشی تک سبھی آزما لیا تھا۔ اب انہیں خالص دینی علم کی لگن تھی۔

باقی صدیقی کے گھر میں میرے سوا اور کسی رشتہ دار کا آنا جانا نہیں تھا۔ میرے ساتھ انکا ذہنی رابطہ کچھ اس وجہ سے بھی تھا۔ کہ میرے والد میاں غلام محبوب سہام قریشی 1939ء میں ایک حادثے میں انتقال کر گئے میری والدہ میرے بچپن میں وفات پا گئی تھیں مجھے انکے خدوخال بھی یاد نہیں۔ جب میرے والد میاں غلام محبوب سہام قریشی نمبردار سہام کا انتقال ہوا تو اسوقت میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ میری دادی سردار خانم حیات تھیں انہوں نے میری پرورش کی۔ ایک دن وہ مجھے ساتھ لیکر باقی صدیقی کے ہاں پہنچیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر انکے ہاتھ میں دیا اور درخواست کی کہ باقی یہ یتیم بچہ ہے گاؤں کا ماحول سخت خراب ہے۔ گلی کوچوں میں آوارگی سے اپنے آپ کو خراب کر لیگا۔ اسے کچھ پڑھنا لکھنا سکھا دو۔ باقی صدیقی نے پہلے تو معذرت کر دی اور اپنی ہمہ وقت مصروفیت کا عذر پیش کیا۔ مگر میری دادی نے انکا پیچھا اسوقت چھوڑا جب وہ رضا مند ہو گئے۔

میں روزانہ سکول سے واپس آنے کے بعد باقی صدیقی کے گھر چلا جاتا تھا اور شام تک وہیں رہتا۔ انکے گھر میں اور کوئی بچہ نہ تھا دوکان سے سودا سلف بھی لا دیتا تھا اور پڑھتا بھی تھا۔ یہ میری (INPRESSIONABLE) عمر تھی میں ہر کام میں باقی صدیقی کی نقل کرنے لگا مجھے انہوں نے ابتدائی طور پر اردو اور حساب کچھ اسطرح پڑھا دیا تھا کہ مجھے زندگی بھر کوئی دقت نہ ہوئی۔ اسکے علاوہ باقی صدیقی کے ساتھ اس تعلیمی رابطے کی وجہ سے مجھے ایسے ایسے ادبی رسالے بچپن ہی میں دیکھنے اور پڑھنے کے لئے ملنے لگے جن تک ادبی ذوق کے بغیر رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

مجھے یاد ہے باقی صدیقی کے ہاں "ادبی دنیا" "آجکل" "نگار" "ہمایوں" "سنگ میل" اور اسی طرح کے دوسرے رسائل ہر ماہ باقاعدگی سے اعزازی طور پر آیا کرتے تھے۔ جن میں ان کی غزلیں اور نظمیں چھپی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس سے میرا ادبی ذوق پیدا ہوا مجھ پر باقی صدیقی کا اتنا اثر تھا کہ ایک زمانے میں باقی صدیقی کے بائیں پاؤں کی ایڑی میں کچھ ایسا درد اٹھا کہ انہیں چلنے میں دقت ہونے لگی۔ جب چلتے تو بائیں پاؤں کو ذرا دبا کر چلتے تھے۔ مجھے انکے چلنے کا یہ انداز بھی اس قدر پسند تھا کہ میں شوقیہ لنگڑا کر چلنے لگا تھا۔ تیری تقلید میں کبک دری نے ٹھوکریں

کھائیں۔

باقی صدیقی جوانی میں مشہدی لنگی کلاہ پر باندھتے تھے اور شلوار قمیض پہنتے تھے اور سردیوں میں شیروانی نما بند گلے والا لمبا کوٹ زیب تن کرتے تھے۔ بمبئی سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں رہے تو وہاں کوٹ پتلون پہننے کی عادت اپنائی۔ مگر یہ سب کچھ عارضی تھا۔ انہوں نے پہناوا وہی پسند کیا جو وہ بمبئی سے واپسی پر پہن کر آئے تھے۔ فلم کمپنی کی ملازمت کا اثر تھا یا وہاں کے رسم و رواج کا کہ باقی صدیقی وہاں سے چوڑے پائنچے والا پاجامہ پہنے ہوئے آئے۔ پاجامہ قمیض ایسا لباس تھا جو باقی صدیقی نے مستقل طور پر اپنا لیا تھا۔ اور آخر دم تک اسی لباس میں رہے ان کے تتبع میں میں بھی ایک عرصہ پاجامہ قمیض ہی پہنتا رہا۔

ایک دن میں باقی صدیقی کے پاس بیٹھا تھا۔ انہوں نے ایک دینی مسئلہ بیان کیا جس میں مولویانہ تنگ نظری اور فرقہ ورایت کے جراثیم تھے۔ میں نے عرض کیا آپ ان مسائل میں نہ پڑا کریں۔ ان کا علم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر آپ پڑھنا ہی چاہتے ہیں تو ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ عنایت اللہ مشرقی جیسے علماء کی تحریروں کا مطالعہ کیا کریں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اسی زمانے میں جماعت اسلامی نے اپنے رسالے ترجمان القرآن کا رسالت نمبر شائع کیا۔ اس رسالے میں سید مودودی اور ڈاکٹر عبدالودود کے درمیان ہونے والی خط و کتابت درج تھی۔ موضوع حدیث نبویؐ کی اہمیت کا تھا۔ ڈاکٹر عبدالودود کے خطوط حدیث کے وجود اور اہمیت پر اعتراضات تھے۔ مولانا مودودی صاحب نے مدلل جوابات دے رکھے تھے۔ میں نے یہ رسالہ "رسالت نمبر" خرید لیا پڑھا اور باقی صدیقی کو پیش کیا۔ وہ چھ دن اسے پڑھتے رہے۔ میں چھ سات دن تک غائب رہا۔

اتوار تھا۔ دفتر سے مجھے چھٹی تھی۔ میں باقی صدیقی سے ملنے گیا۔ وہ حسب عادت اپنے بستر پر تشریف فرما تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ میں نے انھیں سلام کیا تو انہوں نے جواب نہ دیا۔ میں نے اپنی جگہ بدلی اور انکی چارپائی کی پائنتی کی طرف کھڑا ہو کر ایک بار پھر سلام عرض کیا۔ انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور سلام کا جواب نہ دیا۔ مجھے فکر ہوئی کہ شاید مجھ سے ناراض ہیں۔

میں کمرے سے باہر نکل گیا صحن میں چولہے کے پاس ہی اصغری خانم بیٹھی تھیں۔ میں باقی صاحب کے موڈ کا حال اکثر ان سے پوچھا کرتا تھا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کیا بات ہے آج باقی صاحب سلام کا جواب نہیں دے رہے۔ انہوں نے فرمایا اور تو کچھ نہیں ہوا۔ کچھ دنوں سے ایک سرخ رنگ کی کتاب مسلسل پڑھ رہے ہیں۔ اسے پڑھتے بھی ہیں اور بڑبڑاتے بھی۔ خدا

جانے یہ کتاب وہ کہاں سے لائے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ کتاب نہیں ایک مذہبی رسالہ ہے جو میں نے انہیں دیا تھا۔

یہ کہہ کر میں دوبارہ باقی صاحب کے کمرے میں گیا۔ میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ جناب باقی صاحب آپ مجھ سے ناراض ہیں میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہے شاید آپ نے اپنے دل میں میرے خلاف کوئی مقدمہ درج کر لیا ہے۔ خود ہی میرے خلاف کوئی شہادت فراہم کر لی ہے اور میرے خلاف کوئی فیصلہ بھی صادر فرما چکے ہیں۔ جسکی وجہ سے آپ مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ کم از کم آپ نے مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی مہلت ہی دی ہوتی جو ہر ملزم کا قانونی حق ہوتا ہے۔

اس پر باقی صاحب پھوٹ پڑے اور بڑے غصے میں فرمانے لگے تم بڑے ظالم آدمی ہو تم نے مجھ پر ظلم کیا ہے یہ کتاب پڑھوا کر میں نے جواب دیا میں سمجھا نہیں۔ فرمایا۔ اس رسالے میں حدیث نبویؐ کی اہمیت کے خلاف اتنا مواد موجود ہے جسے میں نے اور پڑھے بغیر مرنا چاہتا تھا۔ تم نے یہ کتاب پڑھوا کر مجھ سے یہ حق چھین لیا ہے۔ میں اپنی صفائی میں بہت سی دلیلیں دیتا رہا۔ جن میں سے ایک یہ تھی۔

آپ نے صرف ڈاکٹر عبدالودود کے دلائل ہی نہیں پڑھے ہیں۔ جناب مودودی صاحب کی وضاحتیں ثبوت حوالے اور دلیلیں بھی مطالعہ کی ہیں۔ آپ اب پہلے سے زیادہ محفوظ ہیں۔ آپ کے دینی علم پر اب اور کسی طرح کا حملہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو بھی تو آپ پہلے سے کہیں زیادہ علم رکھتے ہیں اور ہر مخالفانہ دلیل کو ثبوت کے ساتھ رد کرنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ ذرا سوچئے اگر آپ صرف ڈاکٹر عبدالودود ہی کی تحریروں کو پڑھتے ان کے ساتھ مولوی مودودی کے جواب نہ پڑھتے تو آپ کا کیا حال ہوتا۔

باقی صاحب تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے راضی ہوگئے کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ وہ مذہبی اعتقادات پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے میں بلا کے زود رنج واقع ہوئے تھے۔ اس واقعے کے بعد وہ ہر مذہبی کتاب خرید کر پڑھنے لگے تھے۔ مذہبی اور دینی کتب کے مطالعے اور گھر کے ماحول نے انہیں نہایت رحم دل بنا دیا تھا۔ وہ انسانوں میں اونچ نیچ کے قائل نہیں رہے تھے وہ سب انسانوں کو برابر سمجھتے تھے۔ خاص طور پر غریب اور نادار افراد معاشرہ سے تو گویا انکی ایسی قرابت داری پیدا ہوگئی تھی کہ وہ کسی کو بھی گھٹیا یا کم درجے کا نہیں سمجھتے تھے۔

ایک دن صبح صبح وہ کمرے میں چارپائی پر لحاف میں لپٹے بیٹھے تھے میں بھی اسی چارپائی پر ان

کی بائنتی کی طرف بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ مسلسل باہر صحن کی طرف دیکھ رہے تھے میں نے ان کی نظروں کا پیچھا کیا اور دیکھنا چاہا کہ باقی صدیقی کمرے سے باہر کیا دیکھ رہے ہیں۔ صحن میں گھر کی صفائی کرنے والی خاکروب عورت تھی اس کے ہاتھ میں ایک مگ تھا۔ اس نے اصغری خانم سے پینے کے لئے چائے مانگی۔ اصغری خانم ایک پیالی چائے لے کر خاکروب عورت کے پاس گئیں۔

مگر انہوں نے وہ پیالی عورت کے ہاتھ میں نہیں پکڑائی۔ اسے کہا کہ وہ اپنا مگ زمین پر نیچے رکھ دے۔ عورت نے مگ نیچے رکھنے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر اصغری خانم کے سامنے اس طرح رکھا کہ وہ اس مگ میں چائے انڈیل دیں۔ اصغری خانم نے خاکروب عورت کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے مگ میں چائے انڈیلنے سے انکار کر دیا اور قدرے تلخ لہجے میں عورت سے کہا کہ وہ اپنا مگ نیچے زمین پر رکھ دے۔ جب تک عورت نے مگ زمین پر نہیں رکھا۔ اصغری خانم نے اس کے مگ میں چائے نہیں ڈالی۔

باقی صدیقی یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب اصغری خانم واپس آئیں اور عورت جا چکی تو باقی صدیقی اصغری خانم پر برس پڑے۔ سخت ناراض ہوئے اور کہا تم نے اس غریب خاکروب عورت کو انسان نہیں سمجھا۔ جب تک اس نے مگ ہاتھ سے زمین پر نہیں رکھا تم نے چائے نہیں ڈالی کیا وہ اتنی قابل نفرت چیز تھی۔ اللہ سے ڈرو جس نے انسان کو قابل تکریم پیدا کیا ہے۔

شاعر ہوتے ہوئے بھی باقی صدیقی پر مذہبی رنگ اس قدر گہرا تھا کہ ہمہ وقت اپنے آپ کو خالق حقیقی کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ دنیا میں بے ضرر انسان ہوتے ہی ہیں۔ مگر باقی صدیقی سے کم کم زندگی بھر ان سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مگر اتنے کہ اپنے تن کے کپڑے بھی اتار کر سائل کو دے دیں۔ کبھی کبھی ہر انسان کو ایسی ضرورت پڑ سکتی ہے کہ وہ کسی سے مدد کا طلبگار ہو یا قرض کی ضرورت پڑے۔ دولت جمع ہوتی ہی وہاں ہے جہاں رحم کا جذبہ نہ ہو۔ اور جہاں انسانی ہمدردی مذہبی حد تک راسخ ہو وہاں دولت کے جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ کچھ اگر ہوتا ہے وہ بھی جاتا رہتا ہے۔ باقی صدیقی کو ان کی ہمدردیاں جو وہ بہنوں' بھانجیوں اور ان کی اولادوں سے روا رکھتے تھے انہیں جاگیردار سے کرائے دار بنا گئیں۔ وہ معصوم انسان تھے انہیں کبھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا۔ ہر انسان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتے تھے کسی کے کردار کو پرکھ نہیں سکتے تھے۔ خود جو کچھ کرتے تھے دوسروں سے اس کی توقع تو نہیں رکھتے تھے مگر جب کچھ چہرے انکے سامنے اتفاقاً" خود ہی بے نقاب ہو جاتے تو اپنے اخلاص پر بھی کڑھتے

لگتے تھے۔ لیکن اپنے آپ کو سچائی اور اخلاق کے ایسے مقام پر قائم رکھا کہ کوئی شخص بھی زندگی بھر انگشت نمائی نہ کر سکا۔ اگر کوئی ان کے بارے میں مخالفانہ رائے دیتا بھی تو وہ ان کے کردار کے بارے نہیں ہوتی تھی۔ صرف یہی کچھ ان کے خلاف کہا جاتا تھا کہ انہوں نے سب کچھ تج باج کے اپنا کیا حلیہ بنا لیا ہے۔ ایک دفعہ میرے سامنے اپنے ایک امیر کبیر دوست کا ذکر کیا اور بڑی للچائی ہوئی زبان میں کہنے لگے زندگی ہو تو ایسی ہو جیسی اسے نصیب ہے نہ فکر نہ فاقہ اگر یہ حالات میرے ہوں تو میں جی بھر کر شعر تخلیق کروں مطالعہ کروں اور ادب کی خدمت میں لگا رہوں میں نے انکی یہ بات سن کر کہا جناب آپ کو اگر اپنے دوست کی سی آرام اور سکون کی زندگی مل جائے تو شاید آپ ایک مصرع بھی موزوں نہ کر سکیں۔ ادب آرام سکون اور دولت سے تخلیق ہوتا تو لاکھوں میں کھیلنے والے سارے امیر کبیر لوگ ہی شاعر اور ادیب ہوتے۔ باقی صدیقی مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔ جوانی مستانی ہوتی ہے۔ مگر باقی صدیقی پر جوانی بھی آئی تو خاندانی وجاہت' اخلاق اور عزت نفس کا خیال رہا اور عنفوان شباب میں بھی ہوش و حواس پوری طرح قائم رہے باقی صدیقی ایک دن گاؤں کے وسط میں قدیم بارشی پانی کے تالاب کے کنارے کھڑے تھے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر بڑ کا درخت اور گاؤں کا کنواں تھا جس سے گاؤں کی کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ باقی کو کسی شخص کا انتظار تھا۔ کافی دیر اس کا انتظار دیکھا۔ اور بار بار کنویں کی طرف پلٹ کر دیکھتے تھے۔ گاؤں کا ایک آدمی ان کے پاس سے گزرا اور بڑے معنی خیز انداز سے پوچھا باقی صاحب کیا بات ہے یہاں کھڑے کسے دیکھ رہے ہو۔

باقی صدیقی اس کی بات سے فوراً سمجھ گئے کہ وہ شخص ان کے اس طرح کھڑا ہونے سے کچھ غلط معنی نکال رہا ہے۔ اور شاید اسے یہ شک ہو گیا ہے کہ باقی کنویں پر پانی بھرنے والی کسی لڑکی کو دیکھ رہے ہیں۔ باقی صدیقی نے اسے روک لیا اور کہنے لگے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں پڑھا لکھا آدمی ہوں میرا کوئی خاندان ہے اور کچھ تھوڑی بہت عزت بھی۔ تم کیا سمجھتے ہو میں گندگی کھاؤں گا تو اس طرح کسی گندگی کے ڈھیر پر کھڑا ہو کر یونہی کھانے لگوں گا؟ تم غلط سمجھ گئے ہو۔ میرا اگر ایسا ارادہ ہوا بھی تو میں کسی ڈھیر سے گندگی کو اٹھا کر پہلے گھر لے جاؤنگا اسے کھانے کی میز پر خوبصورت پلیٹ میں سجا کر شریف اور مہذب انسانوں کی طرح چمچ سے کھاؤں گا۔ ایسے نہیں جیسے تم سوچ رہے ہو۔ یہ سب میری مائیں اور بہنیں ہیں۔ میں یہاں صرف اپنے ایک دوست کے انتظار میں کھڑا ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔ گاؤں کا وہ شخص شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

گھر کا ماحول علمی اور مذہبی تھا۔ زیادہ وقت مطالعے میں گزارتے تھے اور اگر وقت ملتا تو ان

دوستوں کی محفل میں جا بیٹھتے جہاں شعر خوانی یا عام طور پر گپ شپ ہوتی۔ باقی صدیقی کو تاش کھیلنا کبھی نہیں آیا۔ ایک کھیل پسند تھا۔ وہ تھا کیرم بورڈ ان کے گھر کے سامنے چھوٹا سے میدان تھا جسے کھولا کہا کرتے تھے وہاں طاقت آزمائی کے لیے تین چار پتھر پڑے رہتے تھے۔ جو شادی بیاہ کے موقع پر باہر سے آنے والے باراتیوں سے چیلنج کر کے اٹھوائے جاتے تھے۔ ان پتھروں کے وسط میں دستیاں لگی ہوتی تھیں۔ جنہیں پتھر اٹھانے والا مضبوطی سے پکڑ کر پتھر اٹھاتا تھا۔ کچھ چارپائیاں بھی ہمہ وقت کھولے' میں پڑی رہتی تھیں۔ اور ایک کیرم بورڈ بھی موجود رہتا تھا۔ سورج ڈھلنے پر کچھ نوجوان اور کچھ شوقین عمر رسیدہ لوگ بھی کیرم بورڈ کھیلتے تھے۔

باقی صدیقی کو بھی کیرم بورڈ کھیلنے کا شوق تھا۔ ایک زمانے میں ان کے سب دوستوں نے بٹیر پال لئے باقی صدیقی کو بھی بٹیر پالنے کا شوق چڑھا۔ انہوں نے بھی ایک بٹیر خرید لیا۔ بٹیر کا نام تھا "باوے کا لنڈا" خدا جانے یہ نام کس رعایت سے رکھا گیا تھا۔ اور نہ جانے ان کے دوستوں میں سے کس نے ان کے بٹیر کا یہ نام رکھا تھا۔ بہرحال ان کے بٹیر کا یہ نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔ باقی صدیقی کا یہ بٹیر صرف رسم زمانہ اور دستور کو نبھانے کے لیے تھا انہوں نے اسے کبھی لڑنے کے لیے کسی اکھاڑے میں نہیں اتارا تھا۔ بس گاؤں میں لہر آئی تھی۔ ایک فیشن چلا تھا۔ ہر شخص ہاتھ میں بٹیر لئے پھرتا تھا۔ باقی صدیقی بھی فیشن کے اس اکھاڑے میں اتر پڑے جب یہ لہر گزر گئی تو بس گزر گئی جیسے ساون کے بادل اچانک آتے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں۔

سیاسی افق پر خاکسار تحریک کا نام ابھرا خاکسار جوانوں کے چاک و چوبند دستے چمکدار بیلچے اٹھائے چپ راست' چپ راست کرتے سہام گاؤں کی بڑی گلی سے گزرے تو عورتیں' مرد' بچے ' جوان' بوڑھے دروازوں میں کوٹھوں کی منڈیروں پر مبہوت ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ اس دیکھنے نے کچھ نوجوانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ بھی ذہنی طور پر اس منظم بیلچہ بردار مخلوق کا حصہ بن گئے۔ اور پھر عملاً اس تحریک میں شامل ہو کر چپ راست کرنے لگے۔ خاکسار تحریک میں شامل ہو کر وردی پہننے والوں میں باقی صدیقی بھی شامل تھے ان کے علاوہ میاں گلستان خان جو دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں نائب صوبیدار ہو گئے تھے۔ فتح محمد ارائیں جو بعد میں انگریزی فوج کی خدمت میں مارے گئے۔ میاں غلام حسن قریشی' میاں محمد نظیر قریشی بھی شامل ہوئے۔ چوہڑہرپال کے کچھ نوجوانوں نے بھی خاکساری اختیار کی ان میں نذیر' محمدین' عبدالعزیز' محمد اسلم اور محمد صدیق خاکسار شامل تھے۔

پشاور روڈ پر جہاں اب پاک فوج کی ایک مکمل بٹالین ٹھہری ہوئی ہے وہاں اس زمانے میں کمیں کور ہوا کرتی تھی اور سرکاری اونٹوں کی قطاریں آتی جاتی رہتی تھیں مکینیکل

ٹرانسپورٹ کم ہونے کی وجہ سے Animal ٹرانسپورٹ فوج کا ایک اہم حصہ تھی۔ چکوال روڈ پر سہام کی طرف سڑک وہیں سے مڑتی ہے۔

اس زمانے میں چوہڑ ہڑپال سے سہام بالکل الگ تھا درمیان میں کوئی آبادی نہ تھی صرف سر سبز لہلہاتے کھیت تھے۔ اور چوہڑ ہڑپال سے آگے چکوال روڈ کے کنارے کوئی آبادی نہیں تھی جنگی سیداں تک کھلی زمینیں تھیں یا کوئی ایک آدھ مکان کہیں کسی زمیندار نے اپنی فصلوں کی نگرانی کیلئے کسی کھیت میں بنا رکھا تھا۔ بہر حال چوہڑ ہڑپال اور موضع سہام کے درمیان خاکساروں نے ایک کیمپ لگایا اس میں ایک نمائشی جنگ بھی لڑی تھی۔ میاں بشیر احمد صدیقی مرحوم جو اس وقت خاکسار تحریک میں ناظم اعلیٰ پنجاب و سرحد تھے بھی شامل تھے اور علامہ عنایت اللہ مشرقی خود بنفس نفیس اس مظاہرے کو دیکھنے کے لئے موجود تھے۔

جن لوگوں کو خاکسار تحریک نے متاثر کیا تھا ابھی تک اسکے سحر سے نہیں نکلے۔ باقی صدیقی نے بھی اس تحریک کے نظم و ضبط اور خدمت کے جذبے سے گہرا اثر لیا تھا اس میں شامل ہونے والے قومی جذبے سے سرشار شریف نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا اٹھائی گیرے اور بے راہ رو اشخاص بھی راتوں رات پرہیز گار اور نمازی بن گئے تھے۔

پہاڑوں سے بہنے والے چشموں کا صاف شفاف پانی جب نشیب کی طرف بہتا ہے تو اسے بہت سے دشوار گزار راستوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کبھی کسی شور زمین سے اور کہیں نمکین مٹی سے اور کبھی گندھک آلود چٹانوں سے ہموار میدانوں تک آتے آتے اس میں بہت سے ذائقے اور رنگ مل چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان کا مزاج بھی نسل در نسل بنتا بگڑتا رہتا ہے۔ روح عصر ہر زمانے میں انسانی طبائع کو متاثر کرتی ہے۔ اور بعض اوقات روح عصر آمرانہ احکامات بھی جاری کرتی رہتی ہے۔ بتاتی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے کیا نام رکھیں "کون سا پہناوا پہنیں" کیسے خیالات سوچیں سادہ طبع شریف انسان وقت کے ساتھ آنے والی ہر تبدیلی سے بہت جلد اثر لے لیتے ہیں۔ کچھ ایسے سخت جان ہوتے ہیں کہ ماحول سے کوئی اثر قبول ہی نہیں کرتے۔ باقی صدیقی ان دو انتہاؤں کے درمیان اپنی ایک الگ روش رکھتے تھے۔ زمانہ اوھر کا اودھر ہو جائے اپنے خیالات کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ مانوس بھی ہو جاتے تھے۔ انکا سارا خاندان علمی اور اسلامی زندگی گزار رہا تھا۔ مجموعی طور پر گھریلو ماحول دینی تھا۔ مگر باقی صدیقی اپنے اردگرد فضا کو بدلتا دیکھ رہے تھے آخر کار انہوں نے ایک دم شلوار قمیض یا لنگی کے بجائے پینٹ پہن لیا اور اسی حالت میں وصیف اپنے ماموں قاضی چراغ الدین کے ہاں گئے انہوں نے باقی صدیقی کو پینٹ پہنے دیکھا تو آگ بگولا ہو گئے سخت ڈانٹا اور یہاں تک کہہ گئے کہ

یہ انگریزی ٹوپی ابھی سر سے اتار دو اور آئندہ اسے سر پر پہن کر دھیاں مت آنا۔

باقی صدیقی بلا کے حساس اور غیرت مند واقع ہوئے تھے۔ ہر بات کا فوری اثر لیتے تھے اور اپنے ساتھ پیش آنے والی ہر بات کو کئی کئی دن تک یاد رکھتے اور کڑھتے رہتے تھے۔ میں نے ریڈیو پاکستان راولپنڈی پر آواز کا امتحان دیا۔ پاس ہو گیا۔ اور کئی ایک پوٹھوہاری ڈراموں کے لئے مجھے بک کیا گیا۔ آخری ڈرامے کا نام مجھے ابھی تک یاد ہے "کھیتاں وچ کھلیاناں وچ کنٹرکاں نانشہ" میں خوش تھا کہ میں نے اپنا رول تسلی بخش طور پر نبھایا تھا۔ اسی خوشی میں شام کے وقت باقی صدیقی کے ہاں گیا تو انہوں نے میری تعریف یا حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے بڑے تلخ لہجہ میں آئندہ کے لئے ریڈیو پر جانے سے منع کر دیا میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا تم پروگرام کر کے نکلے تو مجھ پر ریڈیو کے کچھ لوگوں نے طنز کیا ہے اور یہ جملہ کسا ہے کہ باقی اب اپنے رشتہ داروں کو ریڈیو میں دھانسنے لگا ہے۔ کہا میرے لئے یہ ایک بار کا طعنہ کافی ہے۔ اب تم کبھی ریڈیو پر نہیں جاؤ گے۔ اس کے بعد سے 1975ء تک میں ریڈیو کے نزدیک نہیں پھٹکا۔ جبکہ الطاف پرواز اختر امام رضوی' طارق سہدروی' ظفر اکبر آبادی' قمر رومینی اور احمد ظفر سبھی میرے ساتھی تھے اور ریڈیو سے وابستہ بھی باقی صدیقی کے ضرورت سے زیادہ حساس ہونے کا یہ اثر تو مجھ پر پڑا اندازہ کر لیجئے کہ باقی صدیقی خود اپنے لئے کسی سے کچھ مانگنے یا مراعات حاصل کرنے میں کس قدر کم ہمت اور شرمیلے ہونگے؟

عبدالحمید عدم سے باقی صدیقی نے اردو کلام پر شروع شروع میں رسماً" اصلاح بھی لی۔ مگر دونوں کی طبیعتوں میں بعد المشرقین تھا۔ عدم پینے پلانے کے عادی اور باقی صدیقی صوم و صلاۃ کے پابند بہر حال غرض انسان کو ناگوار سے ناگوار شخصیات کو برداشت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ باقی جب کبھی لاہور جاتے تو وہ حاجی منصبدار صاحب کے ہاں قیام کیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب تیزاب احاطہ کوچہ محمدی بغدادی سٹریٹ میں رہائش رکھتے تھے اور مغلپورہ ریلوے ورکشاپ میں مستری کے عہدے پر فائز تھے۔

حاجی صاحب باقی صدیقی کے پھوپھی زاد تھے اور آپس میں نہایت عزت و احترام کا رشتہ استوار تھا۔ لاہور جاتے تو کئی کئی مہینے انکے ہاں ٹھہرتے لاہور میں خاص طور پر احسان دانش کے ساتھ باقی صدیقی کا اٹھنا بیٹھنا مشترکہ ادبی ذوق اور عقیدت مندی کی وجہ سے تھا۔ اس زمانے میں عبدالحمید عدم بھی ملازمت کے سلسلے میں لاہور ہی میں تھے۔ ایک دن رات گئے عدم کا بڑا لڑکا خالد باقی صدیقی کے پاس آیا اور عدم صاحب کے لاپتہ ہونے کی اطلاع دی اور ان کو عدم کی تلاش میں مدد کے لئے کہا۔ اور پوچھا کہ ابو کہاں کہاں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔

باقی صدیقی کو جو جو ٹھکانے معلوم تھے خالد کو ساتھ لئے لئے پھرے مگر عدم کا کوئی پتہ نہ چلا۔ صبح کے وقت دوبارہ عدم صاحب کا لڑکا خالد اور باقی صدیقی تلاش میں نکلے۔ عدم صاحب پانی کے ایک نالے کے کنارے بیٹھے مل گئے۔ وہ خمار میں تھے اور اپنے آپ میں محو جب باقی صدیقی نے انکو اپنی طرف مخاطب کیا اور کہا عدم صاحب آپکو کل رات سے خالد اور میں تلاش کر رہے ہیں۔ کم از کم آپ کے گھر کے افراد کو تو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کیا کر رہے ہیں اور کہاں ہیں۔ یہ سننا تھا کہ عدم صاحب آگ بگولا ہو گئے اور غصے میں کہنے لگے باقی تم ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے ہو۔

یہ نہ کرو وہ نہ کرو تم میرے ذاتی معاملات میں زیادہ دخل دینے لگے ہو میں جو بھی ہوں اور جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں۔ مجھے تمہارے وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں جاؤ تم صرف ملا ہو اور ملا ہی رہو گے۔ شاعر کبھی نہیں بن سکتے۔ باقی صدیقی خالد کو عدم کے پاس چھوڑ کر خاموشی سے واپس آگئے۔ اسکے بعد باقی صدیقی نے عدم سے اپنے تعلقات پوری طرح منقطع کر لئے۔ اچھا ہوا خس کی کم سے جہاں کی پاکی ہو گئی۔ جب عدم صاحب ملٹری اکاؤنٹس راولپنڈی میں تبدیل ہو کر آئے تو کئی بار باقی صدیقی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ عدم کو ملنے سے گریز کرتے تھے۔ ملے بھی تو آپس میں پہلی سی عقیدت اور اپنائیت نہیں رہی تھی۔

بچپن میں باقی صدیقی میری دادی سردار خانم کے کہنے پر مجھے پڑھانے لگے تھے میری دیکھا دیکھی میاں جانداد مرحوم نے اپنے بیٹے اشرف بیگ قریشی کو جو تقریباً" میرے ہی ہم عمر تھے باقی صاحب کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔ باقی صدیقی اور میاں صاحب کے مکانات کی دیواریں مشترکہ تھیں۔ اس دوران باقی صاحب کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے میاں صاحب سے چار سو روپے ادھار لے لئے۔ میاں صاحب کے بیٹے نے کچھ دن ہی پڑھا تھا۔ پھر چھوڑ دیا ایک دو ماہ کے بعد میاں صاحب نے باقی صدیقی سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کچھ دن کی مہلت مانگی۔

اس کے بعد آئے دن میاں صاحب رقم کی واپسی کے لئے پیغام بھیجتے تھے اور باقی یہ کہ کر مہلت لے لیتے تھے کہ ابھی اسکے پاس گنجائش نہیں کہ رقم ادا کر سکیں۔ مقروض اور قرض خواہ کا یہ رشتہ میاں جانداد مرحوم اور باقی صدیقی کے درمیان کوئی دو سال تک قائم رہا۔

باقی کے مسلسل ٹال مٹول سے تنگ آکر میاں محمد جانداد صاحب ایک دن خود باقی صدیقی کے دروازے پر گئے اور رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ باقی صدیقی جانے کس موڈ میں تھے' صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے آپکا کچھ نہیں دینا میں نے آپ سے کبھی کوئی قرض لیا ہی نہیں

آپ خواہ مخواہ مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ صاف انکار سن کر میاں محمد جانداد مرحوم بہت ناراض ہوئے اور کہا تم کتنے جھوٹے آدمی ہو۔ دوسال ٹالتے رہے ہو اور اب صاف انکار کر رہے ہو کہ تم نے مجھ سے کوئی رقم سرے سے لی ہی نہیں اس پر باقی صدیقی نے کہا اگر میں نے کوئی رقم لی بھی تھی تو میں آپکے بیٹے اشرف بیگ قریشی کو ٹیوشن پڑھاتا رہا ہوں۔ یہ جواب سن کر میاں صاحب واپس آگئے اور اس کے بعد اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا چھوڑ دیا۔

اس واقعے کے تقریباً" ایک سال بعد باقی صدیقی وہ رقم جو قرض لی تھی لے کر میاں صاحب کے ہاں تشریف لے گئے اور بڑی معذرت کے ساتھ چار سو روپے کی رقم میاں صاحب کو واپس کی میاں صاحب نے فرمایا باقی تم تو کہتے تھے تم نے مجھ سے کوئی رقم قرض لی ہی نہیں تھی اب تمہیں اچانک یہ خیال کیسے آگیا کہ تم رقم لوٹانے چلے آئے ہو۔ باقی صدیقی نے ہنستے ہنستے بڑے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بھائیا جی" وہ میاں صاحب کو احتراماً" بھائیا جی کہا کرتے تھے۔ آپ مجھ سے بار بار تقاضا کرتے تھے اور میرے پاس رقم نہیں ہوتی تھی۔ وقت بے وقت آپکے پیغامات ملتے تھے اور میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں۔ طبیعت بٹ جاتی تھی اور میرا کام معطل ہو جاتا تھا اور موڈ آف۔ میں نے سوچا رقم تو میں نے ادا کرنی ہی ہے اور اسی وقت ادا کر سکوں گا جب اس قابل ہونگا۔ فی الحال صاف انکار سے اپنا پنڈ چھڑالوں اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپکا قرض چکا سکوں آپ اپنی رقم وصول کیجئے اور میرے انکار سے آپ کو جو ذہنی اذیت پہنچی اسکی معافی چاہتا ہوں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بے محل نہ ہو گا۔ باقی صدیقی کے پھوپھی زاد حاجی منصبدار جن سے انہوں نے اس وقت دو سو روپے ادھار لئے تھے جب وہ 1932ء میں فلم کمپنی میں کام کے لئے بمبئی گئے تھے۔ باقی بمبئی گئے بھی واپس بھی آئے اور ایک عرصہ گزرگیا۔ حاجی منصبدار مرحوم کو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ باقی نے ان سے کچھ پیسے ادھار لئے تھے۔

مگر باقی صدیقی مبلغ دو صد روپے لے کر اچانک حاجی صاحب کے ہاں گئے اور انہیں یاد کرایا کہ بہت عرصہ پہلے میں جب بمبئی گیا تھا تو آپ سے دو سو روپے کرائے کے لئے لئے تھے۔ اور واپس آکر یہ رقم لوٹا نہیں سکا تھا۔ حاجی منصبدار صاحب نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کیا کہ بھائی باقی مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے تمہیں کبھی کوئی رقم ادھار دی ہو۔

باقی صاحب حاجی صاحب کو موقع مقام اور وقت یاد دلاتے رہے کہ جب انہوں نے یہ رقم لی تھی۔ مگر حاجی صاحب مسلسل رقم لینے سے انکار کر رہے تھے۔ انہیں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار باقی صدیقی دو صد روپے حاجی صاحب کے صحن میں پھینک کر چلے گئے کہ اگر آپکو

یاد نہیں تو نہ ہو۔ مجھے تو یاد ہے کہ میں نے آپ سے دو سو روپے قرض لئے تھے۔

باقی صدیقی کا اولین مجموعہ کلام "جام جم" جناب احسان دانش نے منزنگ روڈ لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں زیادہ تر نظمیں تھیں اور انکے ڈکشن اور شعری اسلوب سے عبدالحمید عدم کا اثر صاف نظر آتا تھا۔ احسان دانش نے یہ کتاب چھاپنے میں اتنا طویل عرصہ لگا دیا تھا کہ باقی نظم سے غزل کی طرف آگئے اور اپنا انداز شعر گوئی اس قدر بدل لیا کہ ان کے شعر سے کسی قسم کا کوئی تتبع یا کسی دوسرے ہم عصر شاعر یا کلاسیکی اساتذہ میں سے کسی کے رنگ کا اثر ظاہر نہیں تھا۔ باقی کا اپنا انفرادی انداز تھا جو کسی سے بھی مشابہ نہیں تھا۔ فنون لطیفہ میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ہر نو آموز پہلے اپنے اساتذہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اور ان ہی کی تخلیقات کو ماڈل بنا کر زیادہ تر نقالی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر شاگرد ہونہار ہو تو وہ وقت جلد آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں کے اثر سے آزاد کرا لیتا ہے۔ اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لائق ہو جاتا ہے۔ بہرحال باقی صدیقی نے جلد ہی عدم کے طرز شعرگوئی سے آزادی حاصل کر لی اور اپنا منفرد انداز اختیار کر لیا انکی کتاب جام جم چھپ کر آئی تو باقی بہت آگے نکل چکے تھے۔ اور جام جم کی تخلیقات بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

مجھے یاد ہے جب احسان دانش نے اس کتاب کو چھاپ کر بھیجا تو باقی صدیقی اسے چھپاتے پھرتے تھے اگر یہ کتاب بروقت چھپ جاتی تو شاید باقی صدیقی اسے Own کرتے اب یہ کتاب کم یاب ہے اور اسکی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ باقی نے یہ کتاب اپنے دوستوں میں سے بھی بہت کم لوگوں کو دی۔

جناب ناصر زیدی (مدیر ماہنامہ ادب لطیف) کے پاس ایک نسخہ موجود ہے مگر باقی صدیقی نے خود جام جم کا ذکر تک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ باقی صدیقی بلا کے حساس آدمی تھے اور شاید یہی شدت احساس انہیں بعض اوقات اپنے آپ کو بھی قبول کرنے سے روکتی تھی وہ کل وقتی شاعر تھے اور ایک بار شعر کہہ کر مطمئن نہیں ہو جاتے تھے مسلسل سوچتے اور کلام میں تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔ میں نے انکی کتاب "زخم بہار" کا ایک نسخہ انکے پاس دیکھا تھا۔ یہ چھپی ہوئی کتاب تھی مگر اس کے ہر ورق پر انہوں نے اشعار میں اپنے ہاتھ سے تبدیلیاں کی ہوئی تھیں۔

میرے خالہ زاد بھائی فضل حسین قریشی کے پاس وسپا سکوٹر تھا اور وہ ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ کولیکٹر تھے ایک روز کام سے واپس آرہے تھے جب سہام میں داخل ہونے لگے تو باقی صدیقی ریڈیو اسٹیشن جانے کے لئے گاؤں سے نکل رہے تھے۔ فضل حسین کو دیکھا تو کہنے لگے برخوردار تم خود اپنے کام سے تھکے ہوئے واپس آرہے ہو مگر مجھے ریڈیو جلدی پہنچنا ہے۔ تم مجھے سکوٹر پر

ریڈیو سٹیشن چھوڑ آؤ۔ فضل حسین نے سکوٹر کا رخ موڑ کر باقی صدیقی کو پیچھے بٹھا لیا اور وہ ریڈیو سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا زمانہ تھا۔ ریڈیو پر باقی صدیقی کی ملازمت کا ذکر آیا تو انہوں نے فکر مندی کا اظہار کیا اور کہا برخوردار شاید اب مجھے ریڈیو کو بھی خیرباد کہنا پڑے گا۔ ریڈیو کی فضا میں بھی بہت تبدیلی آگئی ہے پہلے جیسی لکھنے کی آزادی باقی نہیں رہی۔ اب تو بات بات پر حکومت کی طرف سے Directives آنے لگے ہیں۔ اور میں اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں لکھ سکتا۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ باقی نے عمر بھر کسی بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر کی شان میں کوئی قصیدہ رقم نہیں کیا۔ وطن کے حوالے سے انہوں نے بہت سے گیت لکھے جو ریڈیو کے ریکارڈ پر ہیں۔ اور 1965ء کی جنگ کے دوران پنجابی کا یہ گیت "سیبر چلے پیا بھارت نا سینہ بلے پیا" باقی صدیقی ہی کا لکھا ہوا تھا۔ اور جنگ کے دوران فضاؤں میں گونجتا رہا اور پاکستانی غازیوں کے خون کو گرماتا رہا۔

باقی صدیقی کے بارے میں ایک بات جو حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ عشق نام کی کوئی شے ان کے قریب سے بھی نہیں گزری لڑکپن اور جوانی میں کوئی جنسی حوالہ عشق و محبت کے کسی واقعہ کی شکل میں ہر آدمی کی زندگی میں کچھ بدنامی یا نیک نامی کا سبب بنتا ہے۔ مگر باقی صدیقی کے بزرگوں سے پوچھا دوستوں سے ٹوہ لگانے کی کوشش کی مگر کسی سے اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ شاعری عشق و محبت کے بغیر ہوتی نہیں کہتے ہیں تخلیق کائنات کا سبب بھی یہی تھا۔ لامحالہ ایک امر کی طرف دھیان جاتا ہے کہ کچھ اشخاص داخلیت کے ہالے میں اس قدر جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ عمر بھر اپنے اندر سے باہر نہیں آتے۔ ہو سکتا ہے کوئی آئیڈیل باقی کے اندر ہی کہیں اپنی تمام تر جمالیاتی جاذبیتوں کے ساتھ موجود ہو جس کا عشق ادبی تخلیقات کے لئے تحریک کا کام کرتا رہا دریا سطح زمین پر نمایاں طور پر بہتے اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں مگر کاریز اندر ہی اندر شادابی اور تازگی میں ڈھلتی رہتی ہے۔ انکی شادی کی بات گولڑہ شریف کے قریشی گھرانے میں چلی تھی جو آگے نہ بڑھی اور ناکامی کی وجہ وہی فلم کمپنی میں باقی صدیقی کا رول اور پھر راولپنڈی کے ایک سینما کے دروازے پر آویزاں ان کی تصویر ہی تھی جس کے حوالے سے انکے رشتہ دار اکثر یہی کہتے تھے کہ باقی نے خاندانی وجاہت ترک کر کے میراثیوں اور بھانڈوں کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

ان کی ہمشیرہ اصغری خانم نے ایک بار پھر انکے لئے رشتہ تلاش کرنے کے لئے اپنے رشتہ داروں سے ملنا ملانا شروع کیا تھا۔ جب باقی صدیقی کو پتہ چلا کہ اصغری خانم انکے لئے کوئی مناسب

رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں تو انھوں نے یہ کہہ کر سختی سے منع کر دیا کہ مجھے اب اس عمر میں ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میرے ناز و ادا کو برداشت کرے نہ کہ نرم و نازک سی کوئی شخصیت جس کے نخرے میں اٹھاتا پھروں۔

میں ان دنوں ملازمت کے سلسلے میں ایبٹ آباد میں تھا۔ ایک دن مجھے باقی صدیقی کا خط ملا جس میں لکھا تھا۔ فوراً" گھر واپس آؤ جس حالت میں بھی تم ہو وہاں سے چل پڑو ہو سکتا ہے پنڈی پہنچو تو مجھے زندہ نہ پاؤ۔ مری طبیعت سخت خراب ہے۔ میں خط پڑھتے ہی ڈر گیا اور ایبٹ آباد سے آنے والی پہلی بس میں سوار ہو کر راولپنڈی پہنچاباقی صدیقی ان دنوں چوہڑ ہڑپال میں ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے میں نے انکے دروازے پر پہنچ کر دستک دی پھوپھی اصغری خانم نے دروازہ کھولا میں نے ان کے صحن کی طرف نگاہ ڈالی تو باقی صدیقی کو ایک چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھے۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑے۔ میں نے حیرت سے کہا باقی صاحب آپ نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے اتنا پریشان کن خط لکھ کر آپ نے تو میری جان ہی نکال دی۔اور اب آپ ہنس رہے ہیں میں انکے پاس بیٹھ گیا پاس ہی اصغری خانم اور شاہد نصیر بیٹھ گئے۔ وہ بالکل تندرست دکھائی دیتے تھے۔

مجھے ناراض دیکھ کر باقی صدیقی کہنے لگے۔ میں نے مذاق نہیں کیا بس وہ ایک لمحہ تھا جو آیا اور ہم دونوں سے مذاق کر گیا۔ یقین مانو جس وقت وہ خط لکھا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ دوسرا سانس بھی نہیں لے سکوں گا۔ جب میں نے خط پوسٹ کرنے کے لئے بھجوا دیا تو دوسرے ہی لمحے میری طبیعت سنبھل گئی۔ میں اس وقت سے اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ میرا خط ملنے پر تمہارا کیا حال ہو گا بہر حال شکر ہے تم آگئے ملاقات ہو گئی۔ اور اب وہ خطرہ بھی ٹل گیا ہے اللہ پاک نے مجھے زندگی کی کچھ اور مہلت عطا کر دی ہے۔

شاید وہ اختلاجی دورہ تھا۔ جس میں باقی صدیقی مبتلا ہوئے مگر خیر وعافیت رہی۔

باقی صدیقی خوش پوش اور خوش خوراک انسان تھے یہی حال انکی گفتگو اور دوسروں سے میل جول کا تھا بہت اونچا نہیں بولتے تھے۔ چہرے پر اکثر مسکراہٹ رہتی تھی۔ کھل کر کبھی ہنستے نہیں تھے۔ سگریٹ نوشی کی عادت تھی۔ مگر انکا سگریٹ پینے کا انداز بھی منفرد تھا۔ راہ چلتے سگریٹ نوشی نہیں کرتے تھے۔ اس کام کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر بڑے سلیقے سے پیتے۔ کھانا کھانے کے بعد کا وقت عموماً" اس کام کے لئے مختص ہوتا تھا۔ گھٹیا برانڈ کے سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ اگر مجبوری ہو جائے تو بیڑی پینے پر اتر آتے تھے۔ خوراک تھوڑی کھاتے تھے اور اسکے لئے باقاعدہ تیاری کرتے تھے۔ چٹنی اور سلاد کے بغیر انہیں کھانا بدمزہ لگتا

تھا۔ کھیرا ککڑی وغیرہ سلاد کے طور پر بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔

پہناوے کے طور پر چوڑے پائنچوں والا پاجامہ اور قمیص پسند کرتے تھے اور آخر کینوس کے جوتے اس لئے پہننے لگے تھے کہ ان میں چلنے پھرنے کی آسانی محسوس کرتے تھے۔

گاؤں کے اردگرد سرسبز لہلہاتے کھیت ہوا کرتے تھے باقی صدیقی اکثر سیر کے لئے کھیتوں کی میڈوں پر تیز تیز اور محویت میں اپنے آپ سے باتیں کرتے جاتے۔

مجھے یاد ہے انکے ایک بھتیجے مشتاق علی قریشی کی شادی تھی ڈھول بج رہا تھا اور گاؤں کے لڑکے بالے گانے بجانے میں معروف تھے۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس عالم میں بھی باقی صدیقی اپنے کمرے میں شعرگوئی میں مصروف تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے فخر سے کہا تھا دیکھو بجی میں اس ہنگامے میں بھی پورے انہماک کے ساتھ لکھ پڑھ سکتا ہوں۔

عالم اسلام کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ جب سعودیہ کے شاہ فیصل کو بھتیجے نے گولی مار کے ہلاک کر دیا۔ تو باقی صدیقی اس خبر پر سخت پریشان ہو گئے انہیں عجب قسم کی فکر لگ گئی خبریں پڑھتے اور پوچھتے پھرتے تھے کہ اب سعودیہ کا کیا بنے گا۔ مکہ میں کعبہ اللہ اور مدینہ میں روضہ رسولؐ کا خادم کون ہو گا۔

شاہ فیصل کے قتل کی تفصیلات اور سعودیہ کے حالات کئی ماہ تک اخباروں میں اور ریڈیو پر بڑی دلچسپی سے پڑھتے سنتے رہے۔ اور جب انہیں پتہ چلا کہ شاہ کو اس کے اپنے بھتیجے نے قتل کیا ہے تو اسے بین الاقوامی سازش کا نتیجہ سمجھ کر پہلے سے بھی زیادہ پریشان رہنے لگے تھے۔ ہر بات پر کڑھنا تو گویا انکی گھٹی میں شامل تھا۔ ان کے ذہن میں کوئی آتشی محدب شیشہ فٹ تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا اور غیر اہم واقعات کو اہم بنا کر اپنی ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کر لیتے تھے۔

اگر کبھی بیمار پڑتے تو گھر کے افراد کے علاوہ کسی پر اپنی بیماری ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ انکی آنکھوں میں کچھ ایسی روشنی آگئی تھی کہ اپنے عزیزوں کے چہروں سے ان کی نیتیں بھانپ لیتے تھے۔ سخت سے سخت علالت میں بھی باقی صدیقی یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ برادری کے خواتین و حضرات انکی عیادت کے لئے دوڑ پڑیں میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ باقی صدیقی کو مسلسل نزلہ اور بخار رہنے لگا۔ بھوک جاتی رہی اور روز بروز کمزور ہونے لگے۔ انکا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا نزلہ ہوتا تو انہیں بخار بھی ہو جاتا تھا۔

خاندان کی ایک معمر خاتون کو انکی بیماری کا کسی طرح علم ہو گیا تو وہ ازراہ ہمدردی عیادت

کے لئے چلی آئیں۔ باقی صدیقی بڑی سخت تکلیف کی حالت میں بستر پر دراز تھے۔ جونہی خاتون نے عیادت کے لئے چند الفاظ کہے باقی صدیقی نے رضائی اپنے اوپر سے جھٹک کر پھینک دی اور اٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ کیا ہے! مجھے کیا ہے! میں بالکل ٹھیک ہوں! مجھے کوئی بیماری نہیں! خاتون شرمندہ ہو گئی اور معذرت کرتے ہوئے چلی گئی کہ میں نے تو سنا تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے تو پوچھنے چلی آئی۔!

باقی صدیقی نے زندگی میں کوئی زیادہ دوست نہیں بنائے۔ شاید انکا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ کسی سے زیادہ میل جول نہیں رکھتے تھے۔ جن چند اشخاص سے انکا تعلق تھا۔ آخر دم تک انہی کے ساتھ رابطہ رکھا۔ تنہائی پسند تھے اور اپنے آپ کو اپنے آپ تک ہی محدود رکھنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو باقی صدیقی سے تعلق ظاہر کرتے تھے مگر وہ خود انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ اور جن دوستوں سے یاد اللہ تھی انہیں بھی عموماً" اپنے گھر میں مدعو نہیں کرتے تھے۔ باقی صدیقی نے جن دوستوں کی کبھی اپنے گھر میں تواضع کی وہ تعداد میں زیادہ نہیں دو چار ہی ہیں۔ ان میں جناب عبدالعزیز فطرت' ایوب محسن' یوسف ظفر میجر صادق نسیم اور شاہد نصیر کے نام شامل ہیں۔ شاہد نصیر واہ کینٹ سے آیا کرتے۔

باقی صدیقی نعت بھی کہتے تھے۔ جناب یوسف ظفر جب کبھی تشریف لاتے۔ رات گئے تک باقی صدیقی کے ہاں ٹھہرتے اور آپس میں نعتیہ کلام بطور خاص سنتے سناتے۔ مذہب اور تصوف کے اسرار و رموز پر بات چلتی اور نازک اور نہایت ادق نکات پر تبادلہ خیال ہوتا۔ یوسف ظفر کراچی کے ایک صوفی بزرگ بھائی جان کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے تھے۔ باقی صدیقی نے شروع شروع میں جناب عبدالعزیز فطرت سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لی مگر وہ ان کی دی ہوئی اصلاح سے اکثر اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس لئے جناب ایوب محسن سے بھی مشورہ ہوتا تھا۔ ایوب محسن الفاظ اور صحت لفظی کے معاملے میں باقی صدیقی کے خیال میں زیادہ قابل اعتماد تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ محسن صاحب سے زیادہ علم عروض جاننے والا کم از کم راولپنڈی کے ادبی حلقوں میں کوئی نہیں ہے۔ گولڑہ شریف کے پیر نصیر الدین نصیر کی رباعیات فارسی زبان میں ایک مجموعہ کی شکل میں چھپی ہیں رباعی کہنا بڑی مہارت کا کام ہے بہر حال پیر صاحب نے نو عمری ہی میں بہت خوبصورت رباعیات کہی ہیں۔ ایوب محسن نے ان کی بھی ایک رباعی کے وزن میں نقص نکال لیا۔ پیر صاحب کو لکھ بھیجا۔ انہوں نے اپنی کہی ہوئی رباعی میں موجود سقم کا اعتراف کر لیا تھا۔ یہ بات مجھے جناب ایوب محسن' نے خود بتائی تھی۔ ایوب محسن کی اپنی تو کوئی کتاب نظم یا نثر میں ابھی تک سامنے نہیں آئی مگر انکے علمی ادبی اور تنقیدی مضامین ملک کے موقر جریدوں میں چھپتے

رہے ہیں۔ اسکے علاوہ ان کے استادانہ مشوروں سے ان کے ملنے والے تخلیق کاروں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ باقی صدیقی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ جس طرح مہدی افادی نے خود تو خطوط کے علاوہ کچھ نہ لکھا مگر اپنے دور کے لکھنے والوں کو تحریک دے کر بہت کچھ لکھوایا۔ راولپنڈی کی ادبی فضا میں ایوب محسن کا رول بھی کچھ مہدی افادی سے ملتا جلتا ہے۔ باقی صدیقی نے مفعول مفاعلن فعولن کے وزن میں بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ یہ وزن اول اول باقی صدیقی کو ایوب محسن ہی نے تجویز کیا تھا کہ اس وزن میں جس انداز کے اشعار کہے جا سکتے ہیں وہ باقی صدیقی کے مزاج کے مطابق ہے۔

باقی صدیقی نے اپنی کتاب دارورسن کا مسودہ 1951ء میں نواب واجد علی اشک رام پوری کو بھی اشاعت سے قبل گولڑہ شریف بھیجا تھا۔ اشک داغ دہلوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ آخری عمر میں گولڑہ ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ 28 اگست 1985ء کو وفات پائی اور وہیں دربار شریف کی مسجد کے پاس قبرستان میں مدفون ہیں۔ جناب اشک صاحب دیوان شاعر تھے انکا ایک شعر جو ہر شعر فہم کی زبان پر ہے میں نے انہی کی زبانی ریلوے انسٹی ٹیوٹ کے ایک مشاعرے میں سنا تھا اور اب تک یاد ہے۔

اک بار مل گئے تھے سر راہگزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھی کہیں

بہرحال نواب واجد علی اشک رام پوری نے باقی صدیقی کی کتاب دارورسن میں چھپی پہلی نظم جسکا عنوان تھا "غلامی سے آزادی تک" کے کچھ اشعار میں اصلاح تجویز کی مگر باقی صدیقی نے انکا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ مثلاً" اس نظم میں اس بات کا ذکر تھا کہ مغلیہ دور کے تاریخی مقامات میں جہاں جہاں اصل ہیرے موتی سجاوٹ کے لئے جڑے گئے تھے۔ انگریزوں نے بڑی چالاکی سے انکی جگہ کانچ کے ٹکڑے چپکا کر اصل ہیرے نکلوا لئے تھے۔ باقی صدیقی کی نظم کا مصرعہ تھا۔

کانچ کے ٹکڑوں نے ہیروں کی جگہ اپنائی

نواب اشک رامپوری نے اس مصرع میں تبدیلی چاہی تو باقی صدیقی نے یہ کہہ کر انکار کیا تھا کہ اس مصرع کو تبدیل کرنے سے برصغیر کی تاریخ مسخ ہوتی ہے۔ اس لئے یہی ٹھیک ہے جو میں نے کہا ہے۔

یہ وہی نظم ہے جو لاہور سے نکلنے والے رسالہ "جاوید" میں چھپی تھی جسے نصیر انور نسبت روڈ لاہور سے شائع کرتے تھے۔ اس مجلّے کی تمام کاپیاں ضبط کر لی گئی تھیں۔ باقی صدیقی کی"

غلامی سے آزادی تک" کے علاوہ اس رسالے میں دو اور تخلیقات بھی قابل ضبطی سمجھی گئی تھیں۔ ایک تھا افسانہ سعادت حسن منٹو کا "ٹھنڈا گوشت" اور علی سردار جعفری کی نظم "آزاد چین کو سلام"

باقی صدیقی اور علی سردار جعفری کا تو جلد ہی چھٹکارا ہو گیا مگر منٹو کے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پر باقاعدہ مقدمہ قائم ہوا اور منٹو کو عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔

باقی صدیقی لکھنے پڑھنے میں بہت محتاط رہتے تھے۔ وہ ہر ایک کتاب کو پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ انکے پاس جو کتاب آتی تھی اسے سرسری طور پر پڑھتے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انہیں پہلے ہی معلوم ہے۔ شاعری میں چھپنے والی ایسی ہر کتاب جو انہیں اپنے دوست پڑھنے کے لئے تجویز کرتے تھے اسے توجہ سے پڑھتے تھے۔ انہیں فراق گورکھپوری کی "شعلہ ساز" کہیں سے مل گئی تو اسے انہماک کے ساتھ پڑھا اور اشعار پر نشان بھی لگائے۔

انکا شعری ذوق کچھ اس حد تک Fastidious ہو گیا تھا کہ کسی سے بہت کم متاثر ہوتے تھے۔ بہرحال ان کے گرد و پیش جو کچھ بھی لکھا جا رہا تھا اس پر نظر ضرور رکھتے تھے۔

ایک زمانے میں جناب عابد علی عابد لاہور سے راولپنڈی تشریف لائے باقی صدیقی کو انکی آمد کا پتہ چلا تو انہیں ملنے کے لئے گئے۔ اور گھر میں یہ کہہ کر گئے کہ لاہور سے ایک غزل گو شاعر تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی ایک شعری محفل میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔ اس شعری محفل میں شمولیت سے باقی صدیقی کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ جان سکیں کہ لاہور کی ادبی اور شعری فضا کا مزاج اور معیار کیا ہے۔ جسے جاننے کے لئے انہوں نے اپنے گاؤں سہام سے شہر تک کے سفر کی صعوبت برداشت کی ہر زمانے کا جینیس الگ ہوتا ہے اور ان دنوں لاہور واحد ادبی مرکز تھا جہاں سے نئے نئے ادبی رجحانات ابھرتے اور گرد و پیش کی ادبی فضا کو متاثر کرتے رہتے تھے۔

بہرحال شخصیات کا تو ذکر ہی کیا باقی صدیقی کسی بڑی سے بڑی ادبی تحریک سے بھی اس طرح متاثر نہیں ہوئے جس طرح انکے ہم عصر ہر نئے رجحان سے متاثر ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کے جب ترقی پسند تحریک کا ریلہ آیا بہت سے لکھنے والے ساتھی اس کے بہاؤ کے ساتھ یوں بہہ گئے جیسے خزاں زدہ پتے ہوا کے زور دار جھونکے کے آگے آگے اڑنے لگتے ہیں۔ باقی اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم رہے اور اپنی تخلیقات کے لہجے مفہوم اور مزاج میں کسی ہنگامی یا جذباتی تبدیلی کی آمیزش نہیں ہونے دی۔ باقی نے ہر دور میں اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا۔ یہاں تک کہ حلقہ ارباب ذوق کے بھی ممبر نہیں بنے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی صدیقی کی بحیثیت شاعر ایک تسلیم شدہ شناخت آج تک قائم ہے۔

حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے اجلاس مال روڈ پر قائم کنٹونمنٹ کی لائبریری میں منعقد ہوتے تھے۔ جناب عزیز ملک کافی عرصہ حلقہ کے سیکرٹری رہے ان سے پہلے آغا مسعود رضا خاکی قزلباش مرحوم حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری تھے۔ (آغا مسعود رضا خاکی نے گارڈن کالج سے ایم اے اردو کیا تو اتنے نمبر حاصل کئے کہ پنجاب یونیورسٹی کا ایسا ریکارڈ قائم کر دیا جو کئی سالوں تک کوئی نہ توڑ سکا انہوں نے عبدالحلیم شرر کے بارے میں ایک سوانحاتی تذکرہ میں لکھا تھا جو وہ پی ایم ڈی کرنے کے لئے پیش کرنا چاہتے تھے) تو باقی صدیقی نے اپنی غزل بھی ایک تنقیدی اجلاس میں پیش کی غزل کے مجموعی تاثر پر بات شروع ہوئی جو آہستہ آہستہ غیر سنجیدہ ہوتی چلی گئی۔ اور جب غزل کے ایک ایک شعر پر گفتگو کا وقت آیا تنقید کا معیار اتنا پست اور بازاری تھا کہ باقی صدیقی سمجھ گئے کہ میری غزل کے اشعار فاضل ناقدین کے سر سے گزر گئے ہیں۔

سخت مایوس ہوئے اور غصے میں اپنی غزل کی کاپیاں سمیٹ کر پھاڑ دیں اور حلقے کے اجلاس سے باہر نکل گئے۔ اسکے بعد انہوں نے زندگی بھر حلقے کا رخ نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ باقی صدیقی کسی بھی ادبی حلقے کے حلقہ بگوش نہ تھے پھر بھی علمی اور ادبی فضا میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہے۔

باقی صدیقی اول و آخر پاکستانی تھے۔ انہوں نے وطن عزیز سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھی اور ہم وطنوں کو آزاد قوموں کی صف میں کھڑا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اسلامی اقدار سے عشق تھا۔ وہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ دیکھنا چاہتے تھے۔ جب بھی سیاسی فضا میں اکھاڑ پچھاڑ ہوتی وہ ٹھٹھک کر رہ جاتے تھے۔ ہر چیز کو عملاً ویسا دیکھنا چاہتے تھے جیسی کہ وہ اسکے ذہن میں تھیں۔

1958ء کے مارشل لاء نے باقی صدیقی کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے پہلے سے یہ بھانپ لیا تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک نہیں رہے گا اور ایسا ہی ہوا بھی مارشل لاء کا جادو پاکستانی قوم کے سر چڑھ کر بولا۔ ایسا کہ دوسری تمام آوازیں 10 سال کے لئے زیر زمین چلی گئیں۔ قوم، ملک سیاست، معیشت و معاشرت سبھی کچھ رک سا گیا۔ جیسے گھڑی کی سوئیاں کسی نے باندھ دی ہوں۔ اور سورج کو آسمان پر سی دیا گیا ہو۔

آہستہ آہستہ مارشل لا اٹھنا شروع ہوا تو بنیادی جمہوریت نے اپنے بچے جمورے میدان سیاست میں اتار لئے باقی صدیقی نے یہ پتلی تماشا بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جنرل یحییٰ تک آتے آتے تخلیق پاکستان کے وقت کا جوش اور ایمانی جذبہ ء مسلمانی کئی قومیتوں میں تقسیم ہونے لگا تھا پاکستان میں بسنے والوں میں کئی قومی اور لسانی تحریکوں نے تقسیم در تقسیم کا ایسا عمل شروع کر دیا جو آخر کار سقوط ڈھاکہ کا سبب بنا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا پتھر معاشی تھا جو لسانی منجنیق سے پھینکا گیا تھا۔ عین نشانے پر لگا اور ہمارا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سانحہ

نے دوسروں کے لئے ایسی مثال بھی قائم کر دی تھی۔ جو مستقل خطرے کی علامت ہے۔ پاکستان بنا تو ہم ایک پاکستانی قوم تھے۔ پاکستان قائم ہوتے ہی مختلف قومیتوں کی فیڈریشن بن گئے۔ فیڈریشن لازمی نہیں ہوتی اختیاری ہوتی ہے۔

ایوب خان نے اقتدار چھوڑا تو جاتے ہوئے نصیحت کر گئے کہ ون یونٹ نہ توڑنا اور مجیب کو نہ چھوڑنا۔ 1971ء میں جب بھٹو حکومت نے مجیب کو الیکشن جیت جانے کے باوجود اقتدار سے محروم رکھا۔ مجیب نے لندن میں بیان دیا کہ ہم ہمیشہ کے لئے پاکستان سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ بی بی سی پر مجیب الرحمٰن کا یہ اعلان باقی صدیقی کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔

سقوط ڈھاکہ کی خبر ملی تو باقی ریڈیو سٹیشن پر تھے۔ ہر ایک سے دیوانوں کی طرح پوچھتے پھرتے تھے اب پاکستان کا کیا ہو گا؟ اردگرد لوگوں نے باقی صدیقی کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا کہ اب ہم جی کر کیا کریں گے۔ اب ہمارے لئے جینے کا جواز کیا ہے؟ شام کو بی بی سی سے خبریں نشر ہو رہی تھیں باقی اپنے ہاتھ میں قہوہ کی پیالی لئے بیٹھے تھے جب مجیب الرحمٰن کی آواز لندن سے سنائی گئی۔ "ہم ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئے ہیں" یہ الفاظ سنتے ہی روح باقی صدیقی کے جسم عنصری سے پرواز کر گئی۔ مرزا غالب نے جو بات فرہاد کے لئے کہی تھی وہ باقی صدیقی نے اپنی شہادت سے پوری کر دکھائی۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

8 جنوری 1972ء کو "رسوم و قیود" کا سہارا لئے بغیر باقی صدیقی نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اردو کے معروف شاعر سید علی عباد نیساں اکبر آبادی نے جو تاریخی قطعہ گوئی میں ممتاز مقام رکھتے ہیں قطعہ تاریخ وفات لکھا۔ جو انکی تصنیف "درج تاریخ" کے صفحہ پچاس پر درج ہے۔

جس کو سب کہتے تھے باقی آج فانی ہو گیا
تھا جو کم آمیز اور گوشہ نشین و کم سخن
شاعر خوش گو غزل کے رنگ میں تھا منفرد
جس کو اردو سے تھی الفت جس کو اردو سے لگن
ہاتف غیبی کی میرے کان میں آئی صدا
"خلد میں ہے دیکھئے وہ باقی ء رنگین سخن"

(1972ء)

باقی صدیقی اردو غزل اور دوسری تخلیقات کی روشنی میں

قصیدے سے Umbilical Cord کٹنے کے بعد جتنے بھی ادوار گزرے ہیں۔ انہوں نے غزل کے کینوس پر اپنی اپنی محبتوں' کلفتوں اور صداقتوں کے گونا گوں عکس ابھارے اور نقش سنوارے ہیں ادبی اصناف سخن نوخیز پودوں کی طرح جنم لیتی' نشوونما پاتی اور جبلی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرتی ہیں۔ جب وہ اپنی ساخت کو مکمل کر لیتی ہیں تو پھر ان کی ظاہری ہیئت میں تبدیلی آنا بند ہو جاتی ہے۔ اصناف کی بیرونی ہیئت دراصل خلیے کی Outer Memhrane کی طرح ہوتی ہے۔ باقی سب نقش اسکے Contour کے اندر ہی پرورش پاتے ہیں۔ مگر اردو غزل کی مثال جنگ کی دیوی Pallas Athene سے ملتی ہے۔ جو (Zeus) Jupitor کے سر سے مسلح پیدا ہوئی تھی۔ جو پیٹر کے سر میں شدید درد اٹھا تھا۔ ولکن Hephaestus نے اسے اذیت ناک درد میں جتلا دیکھ کر اسکے سر پر کلہاڑے سے ایک زور دار ضرب لگائی تو دیوتا کے سر میں ایک شگاف رونما ہوا جس سے جنگ کی دیوی Pallas Athene اسلحے سے پوری طرح لیس باہر آگئی۔ علی ہذالقیاس غزل بھی اپنی بیرونی ساخت کے لحاظ سے ان ارتقائی مراحل سے نہیں گزری جن سے عام طور پر دوسری اصناف سخن گزری ہیں۔ یہ صنف بنی بنائی اپنی پوری شناخت کے ساتھ قصیدے سے علیحدہ ہوتے ہی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی اور چاہنے والوں کے دل شکار کرنے لگی۔ مگر اس کے اندر کی ہیئت اور امکانی وسعتوں میں لگاتار تبدیلی آئی ہے۔ اور آج بھی مسلسل ارتقائی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔

غزل کے ہر شعر کے دو مصرعے ہوتے ہیں اور دونوں اس قدر مربوط کہ تخلیق کی نیا مطالب و مفاہیم کے بوجھ تلے دب کر ڈولنے نہیں پاتی۔ ہر اچھے شعر سے یہی توقع وابستہ کی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض اشعار میں ابہام کے کئی ایک لطیف پیرائے بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی تہ میں موتیوں کی سی اجلی شعاعیں اور عرفان کی روشنیوں کی کٹیلی کرنیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ جن تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد قاری نہ صرف مطمئن ہو جاتا ہے بلکہ اپنے آپ کو پہلے سے بہتر پاتا ہے۔ مسرت و انبساط کی ایک لہر اسے زمین کی وسعتوں' پانی کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں میں اپنے ساتھ اڑائے پھرتی ہے۔ اردو غزل مطمئن اور معتبر ہاتھوں میں پروان چڑھی ہے اور اسے پہلے پہل غم عشق کے مسائل اور ہجرو وصال کے عذاب و ثواب کی لذتیں نصیب رہی ہیں۔

غزل جب سرکاروں درباروں سے نکلی تو اسے زمین کی تختیوں آسمان کی گردشوں اور نا مساعد حالات کی تمازتوں کا تجربہ ہوا۔ پہلے غم دوست سے دل جلتا تھا اب تانبے کی طرح تپتی زمین پر

پاؤں کے تلوے بھی جھلسنے لگے۔ سر پر سائبان ہونے یا نہ ہونے کا احساس بیدار ہوا۔ اور غم روزگار کے چہرے کلیجہ چھلنی کرنے لگے۔ بس اسوقت سے آج تک آتے آتے غزل کئی ہاتھوں سے گزرتی ہوئی جدید دور میں داخل ہوئی۔ غزل کے اس ارتقائی سفر کو پانی کے بہاؤ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ غزل کا صاف شفاف بدن وقت کی کوکھ میں موجود ہر طرح کے تخلیات کو جذب کرتا رہا ہے۔ غزل جن لوگوں کی بھی ہم سخن و ہم زبان رہی ہے۔ ان کے رہن سہن' خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے سارے راز غزل کے سینے میں پوشیدہ ہیں۔ غزل ظالم بھی ہے مظلوم بھی۔ ظالم اس لئے کہ معشوقانہ غمزہ وادا آج بھی اپنے چاہنے والوں کو مار رکھنے کیلئے کافی ہیں۔اور مظلوم اس طرح کہ ہر شخص جو تین انگلیاں اور ایک قلم رکھتا ہے۔ بیچاری غزل ہی کو سب سے پہلے تختہ مشق بناتا ہے۔ اسکے باوصف غزل ہی کا حوصلہ ہے کہ اپنی سخت جانی اور کشادہ دلی کے بل پر ہر ناگوار کو گوارہ کرتی چلی آرہی ہے۔ شاید غزل کی عظمت و وقار کا راز اسی خلق عظیم میں پوشیدہ ہے۔ غزل کی دنیا میں کئی نامور اور کڑیل نام سامنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔

غزل نے ہر موسم کے ساتھ اپنے پیراہن بدلے ہیں۔ اور اجنبی ہاتھوں میں بھی اپنی محبتوں اور صداقتوں کے پھول بکھیرے ہیں۔ غزل جواہرات کی ایسی کان ہے جس کے ذخائر میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار و مغاں
ہزار بادہ ء ناخوردہ دررگ تاک است

شاہ مراد اور ولی دکنی سے چل کر علامہ اقبال اور پھر اقبال سے فیض احمد فیض تک آتے آتے اردو غزل کو تھک ہار جانا چاہئے تھا مگر اس میں ذوق سفر اسقدر تازہ ہے گویا یہ آج ہی سفر پر نکلی ہے۔ غزل کی کئی ہمسفر اصناف سخن تھک ہار کر راستوں میں ہی کہیں بیٹھ گئی ہیں۔ جن کے ٹھہرے پانیوں پر فراموشی کی کائی کچھ اس طرح جم چکی ہے کہ اس کے نیچے جھانک کر دیکھنے والا کوئی نہیں۔ جب کہ غزل نے مولانا حسرت موہانی' فانی بدایونی مرزا یاس یگانہ چنگیزی' اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی جیسے قد آور غزل گو شعراء کی ہم رکابی میں اپنا سفر جاری رکھا ہے۔ یہ سب باکمال شعرا غزل ہی کی زلف تابدار کے اسیر رہے ہیں انہوں نے غزل سے بہت کچھ لیا اور پھر تخلیقی سطح پر اتنا کچھ لوٹایا کہ اس کا دامن اسلوب کی نئی کرنوں سے جھلملا رہا تھا جب عبد الحمید عدم' اختر ہوشیار پوری' ناصر کاظمی' احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر وزیر آغا اور بہت سے دوسرے غزل گو شعرا نے غزل کو نئے طرز احساس سے روشناس کرایا۔

جبکہ باقی صدیقی نے غزل کی فضا کو مزید وسعت دے کر اسے فکر کی گہری اور سنگلاخ گھاٹیوں میں سفر جاری رکھنا سکھایا۔ باقی صدیقی جب وہ غزلیں اور نظمیں لکھ رہے تھے جو اب "دارو رسن" میں شامل ہیں تو اس وقت تہذیبی سطح پر ایک دنیا مر چکی تھی اور دوسری پیدا ہونے کے لائق نہیں تھی۔ ادبی اور تہذیبی اقدار ریت کے ٹیلوں کی طرح تحلیل ہو رہی تھیں۔ اکثر سچائیاں اپنا اعتبار کھو چکی تھیں۔ خوابوں سے زیادہ مادی اشیاء کو وقعت دی جانے لگی تھی۔ ادبی اقدار کے لئے آگے بڑھنے اور پہنچنے کی ساری راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ ایسے عالم میں کسی شاعر کا کسی ادبی مرکز سے دور رہ کر تخلیقی سطح پر زندہ رہنا اور فنی سطح پر اپنے آپ کو منوانا آسان کام نہیں تھا۔ مگر باقی صدیقی نے بہرحال اپنی سمت سفر کو درست رکھا انہوں نے اپنے تخلیقی عمل میں غزل کی توانا روایت سے انحراف برتا نہ اس کے جوئے کو غلامانہ بے حسی کے ساتھ زیب تن کیا۔ یہی وجہ ہے کہ باقی صدیقی کی غزل کلاسیکی غزل کے چھتنار پیڑ کے تنے سے پھوٹنے والی تازہ کونپل کی طرح ہے جس کے نازک بدن پر پھول پات بھی اپنے ہیں۔ باقی صدیقی کی غزل کے مجموعے۔ دارورسن' زخم بہار اور کتنی دیر چراغ جلا غزل کے ایسے جھروکے ہیں جو اس منظر کی طرف کھلتے ہیں جو باقی صدیقی کے تخلیقی عمل سے اردو غزل کے کینوس پر ابھرتا ہے۔!

اب ہم باقی صدیقی کی غزل کے مجموعوں کا زمانہ ء اشاعت کی ترتیب سے مطالعاتی جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ باقی صدیقی کے کلام سے انکے تخلیقی عمل اور فنی ارتقاء کا بھی کچھ اندازہ ہو سکے۔ انہوں نے خود بھی تقریبا" ہر غزل کے ساتھ اسکا سن تخلیق درج کر دیا ہے۔ شاید انکے ذہن میں بھی ہمارے لئے یہ آسانی پیدا کرنا تھا۔ توانا شاعری صرف شاعری نہیں ہوتی وہ ایک ایسا قابل اعتماد ذریعہ بھی ہوتی ہے جس سے کسی دور کی تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔!

"دارورسن"

دارورسن "سے پہلے" جام جم احسان دانش نے دانش گاہ پنجاب مزنگ روڈ لاہور سے شائع کی تھی جو اب کم یاب ہے۔ اس مجموعے میں باقی صدیقی کے زیادہ تر وہ قطعات اور نظمیں شامل ہیں جو نیاز فتح پوری کے رسالہ نگار میں چھپ کر شہکار ہونے کی سند پا چکی تھیں۔ بہرحال "دارورسن" باقی صدیقی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے اسکے پبلشر کا نام حکیم عبدالغنی ہے۔ 1951ء میں پہلی بار یہ کتاب قومی کتب خانہ راولپنڈی نے ایک ہزار کی تعداد میں شائع کی تھی۔ پیش لفظ کے بجائے فارسی کا ایک شعر درج ہے۔

عمر لیست کہ افسانہ منصور کہن شد
من از سر تو جلوہ دہم دارورسن را

کتاب میں نظمیں قطعات اور غزلیں شامل ہیں آخر میں "خون چکیدہ" کے عنوان سے باقی صدیقی کے متفرق اشعار درج ہیں۔ یہ مجموعہ باقی کی نظم "غلامی سے آزادی تک" سے شروع ہوتا ہے۔ جو لاہور کے ماہنامہ جاوید میں چھپی جسے نصیرانور نسبت روڈ سے شائع کیا کرتے تھے۔ اس رسالے میں چھپنے والی تین چیزیں قابل اعتراض سمجھی گئی تھیں۔ علی سردار جعفری کی نظم "آزاد چین کو سلام" باقی صدیقی کی "غلامی سے آزادی تک" اور سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" علی سردار جعفری اور باقی صدیقی کا تو جھٹکارا ہو گیا تھا۔ سعادت حسن منٹو پر فحاشی کا مقدمہ چلایا گیا۔

باقی صدیقی کی یہ نظم برصغیر کے سیاسی اور تاریخی پس منظر میں لکھی گئی تھی اور اسکے مطالب کو متعین کرنے کے لئے کچھ اہم واقعات کے ساتھ وقوع پذیر ہونے کا سن بھی درج ہے۔ نظم طویل ہے اسکے چند بند ہی یہاں درج کئے جا سکتے ہیں۔
انگریزوں کے یہاں آنے اور حکومت قائم کر لینے کو یوں بیان کیا گیا ہے۔!

ٹھوکریں کھاتے ہوئے غم کے بیابانوں میں
زندگانی کا سکوں نذر زمانہ کر کے
چند ڈاکو مری جنت میں چلے آئے تھے
چور فاقوں سے تجارت کا بہانہ کر کے

1857ء جنگ آزادی کے حریت پسندوں کی طرف اشارہ ان اشعار میں کچھ اس طرح ملتا ہے۔

شیر جنگل کے اور آداب غلامی تو بہ
راس آئی نہ حقائق کو خیال آرائی
جب پڑا روحوں پہ آئینہ حالات کا عکس
آرزو جاگ اٹھی احساس نے لی انگڑائی

مگر جنگ آزادی ناکام رہی۔

اک بگولے کی بیاباں میں حقیقت ہی کیا
زندگی موت کی آغوش میں لہرا نہ سکی
رہ گئے سینوں ہی سینوں میں تڑپ کر جذبے
صبح کی روشنی ابھری تھی مگر چھا نہ سکی

انگریزوں کا ناکام حریت پسندوں کے ساتھ سلوک

دیکھ کر وقت کے تیور ستم ایجادوں نے
جیل تو جیل تھے راہوں میں صلیبیں گاڑیں
پیچ کھاتے ہوئے جسموں پہ تبر برسائے
کند نیزوں سے دھڑکتی ہوئی نبضیں پھاڑیں

اور 1857ء کی تحریک آزادی کے پوری طرح کچلے جانے کے بعد کا منظر باقی صدیقی نے یوں تصویر کیا ہے۔

مسند عدل پہ جب ناز سے ڈاکو بیٹھے
جھوم کر نشے میں تقدیروں سے تقریریں ملیں
جان پہ کھیلنے والوں نے سزائیں پائیں
اور غداروں کو منصب ملے جاگیریں ملیں

بمبئی کے ساحل پر انگریزوں کے خلاف نیوی کی جنگ اور اسکی ناکامی

دم گھٹے جاتے تھے نفرت کے دھوئیں میں لیکن
کوئی سنتا نہ تھا مظلوموں کی فریادوں کو
تلخیاں زیست کی جب ضبط کی حد سے گزریں
شور ساحل سے اٹھا مار دو جلادوں کو

زیست کے دھوکے میں حالات کے دیوانوں نے
موت کے قدموں پہ سر رکھ دئے جانیں رکھ دیں
دام میں شیروں کو لاکر ستم ایجادوں نے
تلملاتی ہوئی نبضوں پہ سنانیں رکھ دیں

15 اگست 1947ء میں انگریز برصغیر کو آزادی دے کر جس انداز سے نکلے ہیں اسے ان اشعار میں دیکھ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ عالمی سطح پر سیاسی صورت حال اور انگریز کے سازشی ذہن کو پڑھ سکتے ہیں۔

جب کیا وقت نے مجبور تو صیادوں نے
ایسے انداز سے دروازے قفس کے کھولے
بڑھ کے احباب نے احباب کی راہیں روکیں
اٹھ کے ہمسایوں نے ہمسایوں پہ خنجر ہولے
باغ میں آگ لگی ایسی کہ ہر ڈالی نے
اپنے ہی پھول چنے' اپنی ہی کلیاں نوچیں
بیٹھ کر بغض و عداوت کے گھنے سائے میں
خلق نے اپنے ہی نقصان کی باتیں سوچیں

اور پھر اس خونی ڈرامے کا آخری منظر جو اپنی بدلی ہوئی صورت میں کئی سطحوں پر اب بھی جاری ہے اور کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔!

باغ تقسیم ہوا' پھولوں نے تختے بدلے
خون پانی کی طرح' بہنے لگا راہوں میں
شعلے بن بن کے ضمیروں کی سیاہی لپکی
"چھپ کے جلنے لگے صیاد کمیں گاہوں میں"

یہ نظم باقی صدیقی نے 1948ء میں لکھی تھی۔ اسکی تخلیق کا سن کتاب میں نظم کے آخر میں درج ہے۔

دارورسن میں باقی صدیقی نے 1967ء سے 1951ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل کی ہیں۔ ہر غزل کے آخر میں اسکی تخلیق کا سال بھی درج ہے۔ جس سے باقی صدیقی کے فنی اور تخلیقی ارتقاء کا اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پوری کتاب کے مجموعی تاثر کی فضا پر ایک بھرپور تنقیدی رویہ پورے انہماک کے ساتھ چھایا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد برصغیر میں ہنگامی صورت حال سے پیدا ہونے والے حالات اور انکا انسانی اذہان پر اثر امید وبیم کی باہم آویزش اور غیر یقینی صورت حال کابوس کی سی کیفیت پیدا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

باقی صدیقی کے کلام میں طنز کے چبھتے ہوئے تیر بھی ہیں اور اصلاح احوال کی ضرورت کے احساس کے ساتھ امید کی کرن بھی شامل ہے جو اندھیروں کو چیر کر صبح نو کی نوید دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

باقی صدیقی نے سماجی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے اہم واقعات و حالات سے مواد حاصل کیا ہے جسے اپنے فن کی کٹھالی میں پگھلا کر آفاقی عمومیت عطا کر دی ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے، کہ باقی صدیقی نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ جمالیاتی حظ کا ذریعہ بھی ہے اور آفاقی قدروں کا نقیب بھی۔

شاعری تفصیل کے بجائے تاثرات کا فن ہے، اسکے باوصف نظم میں عموماً" بات کھول کر بیان کی جاتی ہے۔ کبھی نتیجہ نکال دیا جاتا ہے اور کبھی قاری کے ذہن پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا غزل کے شعر کے دو مصرعوں میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ کوئی بات مفصل طور پر کی جا سکے۔ صرف خوردبینی اشارات ہوتے ہیں جن کی کرچیوں سے جہان رنگ و بو تخلیق کرنا پڑتا ہے۔

باقی صدیقی بنیادی طور پر نظم کے راستے اردو غزل کی طرف آئے ہیں اس لئے ان کے ہاں مفہوم منہ چھپائے ہوئے شرماتا لجاتا سامنے نہیں آتا۔ باقی سیدھی اور صاف بات اپنے پورے ادبی تخلیقی اور شاعرانہ محسنات کے ساتھ بجلی کے کوندے کی سی تیزی سے ادا کر جاتے ہیں۔ ان کا گفتگو کا سا لہجہ تاثر میں بجھے ہوئے نشتر کا کام کرتا ہے۔ رعایت لفظی اور کفایت لفظی باقی صدیقی کے کلام کی جان ہے۔ تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنا باقی کی کرامت ہے۔

"غلامی سے آزادی تک" کے بعد اس مجموعے میں شامل دوسری نظم کا عنوان ہے "کھچاؤ" اس نظم میں فرقہ وارانہ فسادات اور بربریت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ تعصب کی بو نے خیالات کو زہر آلودہ کر دیا ہے۔ خون انسان کے ساغر پی کر دنیا بہک گئی ہے۔ جبکہ عدم تحفظ کا احساس قریہ قریہ خوف و ہراس کی صورت میں دم سادھے مبہوت کھڑا ہے۔ فسادات کے بعد بظاہر خاموشی دکھائی دیتی ہے مگر اس خاموشی کی تہہ میں ابھی ہزاروں خطرات موجود ہیں۔ اس لئے زندگی کے معمول پر آنے کے ابھی امکانات کم ہیں۔

سطح دریا کی خموشی پہ نہ دھوکا کھانا
دل نہنگوں کے ابھی پوری طرح صاف نہیں

تفریق پرستوں کا بخار ابھی اترا نہیں ہے۔ اور خام سیاست کے بھوکے فقیر خون پینے کے لئے موج در موج سینوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی امن و امان کے لئے کچھ اور انتظار کھینچنا ہو گا۔ زندگی کے معمول پر آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ ظلم کی انتہا ہو چکی ہے اور کسی

معاملے میں انتہا وہ مقام ہوا کرتا ہے جس سے آگے ہر قسم کے زوال کا دور شروع ہوتا ہے۔ باقی صدیقی ظلم کی اس انتہائی شکل کو بجھتی ہوئی شمع کی آخری لو سے مشابہ بتاتے ہیں۔

ظلم کی اٹھتی ہوئی موج کو حیرت سے نہ دیکھ
شمع کی آخری لو تیز ہوا کرتی ہے

1947ء سے 1949ء کے دوران میں لکھی گئی تمام نظموں کی فضا ایک جیسی تنقیدی اور غیر یقینی فضا کو لئے ہوئے ہے۔ برصغیر کے اس وقت یہی حالات تھے ایک دنیا ختم ہو چکی تھی اور دوسری ابھی اس قابل نہیں تھی کہ یہ خیرہ خوبی جنم لے سکے۔

اس سے اگلی نظم ساقی نامہ بھی اپنی تخلیق کے عہد کو پیش کرتی ہے۔ جب سیاست' اخلاق اور معاشرت سبھی کچھ از بن کندہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

وہ اٹھی ہوس کی گھٹا ساقیا
زمانے کی بدلی فضا ساقیا

تفریق' عداوت' مصائب' تعصب اور کروٹ بدلتی ہوئی روایات دماغوں میں وحشت اور دلوں میں دہشت پیدا کرنے لگی ہے۔ نتیجتاً"

ہوس میں جہاں کھو گیا ساقیا
زمانے کو کیا ہو گیا ساقیا

گردو پیش پر نظر ڈالیں تو جس نظام حیات کے لئے سب کچھ قبول کیا گیا تھا۔ اسکے کہیں آثار تک نظر نہیں آتے۔ ایک بڑا سوالیہ نشان ہر چیز پر کندہ دکھائی دیتا ہے۔

یہی ہے وہ کیا زندگی کی بہار؟
ہمیں جس کا صدیوں سے تھا انتظار
کہاں ہے محبت کی وہ کائنات
کہاں ہے وہ دلکش نظام حیات

یقیناً" یہ وہ دنیا نہیں اور نہ ہی یہ رواداریوں اخلاص اور عجز و نیاز کی سر زمین ہے۔ کہنے والی زبانیں جو کچھ کہہ رہی ہیں اور دیکھنے والی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں۔ اس میں اس قدر تضاد ہے کہ لاحاصلی ہر کسی کا مقدر نظر آتی ہے۔ ایمان وایقان کی پر سکون فضا اوہام کی آماجگاہ بن

چکی ہے۔ وقت گریبانوں میں ہاتھ ڈال کر کھینچتا ہے اور کہتا ہے۔

نہ اوہام کے جال بن ساقیا
زمانے کی آواز سن ساقیا
ہویدا ہے کیا گرم آہوں سے دیکھ
زمانے کو میری نگاہوں سے دیکھ

دیکھ کہ خون کے دریا بہانے اور زمین کے سینے پر لہو رنگ لکریں کھینچنے کے باوصف ہر طرف وہی غم' دام اور صیاد ہیں۔

وہی غم وہی دام و صیاد ہیں
کہیں کس طرح ہم کہ آزاد ہیں
ابھی ظلم کا نام تقدیر ہے
جہاں زر پرستوں کی جاگیر ہے
روایات سے کام چلتے نہیں
کھلونوں سے اب دل بہلتے نہیں

کدھر ہے زمانہ کہاں ہے سماج جہاں چاہتا ہے غموں کا علاج

اس عہد کی ساری نظمیں ایسا منظر نامہ تخلیق کرتی ہیں جن میں 1947ء سے 1949ء اور پھر آج تک کا پورا عہد بولتا ہوا صاف سنائی دیتا ہے۔ بھکارن' قسلی مارکٹ' جلوس' سپیرے' مطربہ راگ سنا' استقبال' ٹی پارٹی' رقص' مشاعرہ' فٹ پاتھ' یہ شمعیں بجھا دو' جلسے اور قطعات ایک ہی داستان کے مختلف ابواب ہیں۔ قومی ترقی جلسوں' جلوسوں' نت نئے نعروں' بیانوں اور گا' گے' گی کی گردان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔

کل بھی اک جلسہ ہوا آج بھی جلسہ ہو گا
اور جلسے میں کریگا کوئی تقریر برائے تقریر
ایک الفاظ کا جال
پیچ در پیچ خیال
الغرض کل کی طرح آج بھی اک مرد حکیم
گرم لفظوں کے دہکتے ہوئے انگاروں پر

رنج و آلام کی زنجیریں پگھلتی ہوئی دکھلائے گا
اور ڈنر کھا کے چلا جائے گا

"دارورسن" میں شامل غزلیں' باقی صدیقی کی غزل کے مزاج کو متعین کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ باقی کی غزل کے خدوخال اب تک اس قدر نکھر چکے ہیں کہ ان کی تراش خراش میں ندرت تو پیدا ہو سکتی ہے۔ تبدیلی ممکن نہیں باقی صدیقی اب اپنے انداز فکر اور زاویہ نگاہ پر مطمئن بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی انفرادیت کو پا لیا ہے اور وہ ادبی فضا پر ایک منفرد نقش بٹھانے میں آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ اب وہ شعری ادبی فضا کا لازمی حصہ بن چکے ہیں انہوں نے ایک نیا لہجہ ایجاد کیا ہے۔ جسکی موجودہ فضا میں ضرورت تھی اور اب وہ بزم شعر و ادب کی فضا میں کچھ اس طرح تحلیل ہو چکے ہیں کہ انہیں اور انکے لہجہ کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

بہار بزم میں تحلیل ہو گیا ہوں میں
کہاں ہیں بزم سے مجھ کو نکالنے والے

باقی صدیقی کسی ادبی انجمن یا حلقے کے باقاعدہ ممبر نہیں رہے انکا مزاج کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ 100 فی صد کسی کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ ادبی دنیا میں چلنے والی تحریکیں بھی انہیں اس سطح پر متاثر نہیں کر سکیں کہ وہ کسی کے پیچھے زور دار ریلے کے ساتھ تنکے کی طرح بہہ جاتے۔ یہاں تک کہ برصغیر میں سب سے زیادہ زور دار تحریک ترقی پسند تحریک تھی جس نے ادبی فضا میں بنیادی تبدیلیوں کے امکانات پیدا کئے تھے۔ غم جاناں سے غم دوراں کی طرف تخلیقی قبلہ کی تبدیلی اس تحریک کا نمایاں اثر تھا۔ ادب میں مقصدیت ایک زور دار نعرہ بن کر ابھری مگر باقی صدیقی نے اس سے باہر رہ کر بھی تخلیقی کام روح عصر کے تقاضوں کے عین مطابق سرانجام دیا۔ انکے داخلی تخلیقی وجدان میں فطری طور پر اتنی قوت موجود تھی کہ وہ خارجی دباؤ کو قبول کئے بغیر جاندار غزل کہہ رہے تھے۔ انکی غزل صرف زبان دانی کی بے ساکھیوں پر ایستادہ نہیں تھی خود اپنے فکری رجحانات کے بل پر اپنے آپکو منوا رہی تھی۔

استحصالی اور مصنوعی معاشرتی رویوں کا ادراک باقی صدیقی کی غزل میں ترقی پسند تحریک کے ناک نقشہ نکالنے سے بہت پہلے فکری سطح پر موجود تھا جسے باقی صدیقی کے قاری نے چاہا' سراہا اور اس سے حظ اٹھایا۔

خون اخلاص کی بو آتی ہے پیمانے سے
رند گھبرا کے نکل آئے ہیں مے خانے سے

یہ وہ فکری رویہ ہے جو باقی صدیقی کے کلام میں انکی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ انکی شاعری بلوغت کی شاعری ہے' حالات واقعات اور مسائل کی شاعری ہے جس کا اثر دور جدید کے ہر انسان نے اپنے اردگرد ہر قسم کی توڑ پھوڑ میں عملاً" محسوس کیا ہے۔ باقی صدیقی نے صرف تجربات کو نظم نہیں کر دیا ان امکانی نتائج کا استنباط بھی کیا ہے۔

نہ اتراؤ صیاد کی دوستی پر
اسی باغ میں تھا مرا آشیانہ

دنیا اور اہل دنیا کے مزاج کو غزل کا موضوع بنا کر ایسا ادب تخلیق کرنا جو عصر حاضر کے ہاتھوں سے نکل کر اخلاف تک کو اپنی گرفت میں لے سکے باقی کے مزاج میں شامل ہے۔ اس کے اشعار اپنے مفہوم کی وجہ سے کبھی پرانے نہیں ہو سکتے۔

اک نہ اک چیز کی کمی ہی رہی
کبھی ساغر کبھی شراب نہیں

یہ کمی ہی انسانی حیات کا وہ پہلو ہے جسکی وجہ سے آدمی تمام شعبہ ہائے زندگی میں معجزانہ تبدیلیاں لانے کے لائق ہوا ہے۔ حیوانات کی زندگی میں کسی قسم کی کمی کا احساس موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی جانور کو بھی دیکھ لیجئے۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر مطمئن نظر آئے گا کہ آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ اسکے برعکس انسان کسی صورت میں بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ فرض کیجئے انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح مطمئن پیدا کیا جاتا تو اسکی زندگی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ آسکتی اور کھوہوں اور غاروں سے باہر نہ تو کوئی تہذیب پیدا ہوتی اور نہ شہر آباد ہوتے علوم و فنون نام کی کوئی چیز ہوتی اور نہ سائنس کے کمالات انسان کے لئے آسائشوں اور خوبصورتیوں میں ڈھل سکتے۔

کیا بتائیں کہ زندگی کیا ہے
ایک منزل مگر قریب نہ دور

زندگی کی اسی غیر واضح اور غیر یقینی حقیقت کو قابل فہم اور کار آمد بنانے کے لئے ہی تو

انسانی کاوشیں ہیں۔ زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی سے محرومی کا احساس ساز و سامان کے ساتھ بے سرو سامانی کا دکھ ہی تو انسانی حیات میں نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ تحرک پیدا کرتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ نت نئے آفاق ابھرتے چلے آتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے باقی خیال آتا ہے
وہاں نہیں ہے مری زندگی جہاں تھی کبھی

باقی صدیقی کی نظر چھوٹے چھوٹے نفسیاتی اور خوردبینی حقائق پر بھی رہتی ہے۔ انکی طبع حساس پر مفاہیم کے وہ جاذب نظر نقش ابھرتے ہیں جن سے وہ اپنے شعر کا خمیر اٹھاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے بارے میں یہ جانے بغیر زندگی گزارتا ہے کہ اسکے لئے چند مفروضے اور خوش فہمیاں ضروری ہیں اگر وہ ٹھوس حقائق کی شکل میں اسکے سامنے آجائیں تو زندگی بدمزہ اور دشوار ہو جائے۔ مثلاً" ذاتی حسن' قومی شجاعت' وطن' خاندان' علم اور عقل کے بارے میں خوش فہمیاں ہماری زندگی کو مطمئن اور حسین بنائے رکھتی ہیں مگر کبھی کبھی جب کوئی معصیت اچانک رونما ہو کر غرور اور انا کے غبارے سے ہوا نکال دیتی ہے تو سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔

زندگانی کا سب مزہ باقی
منحصر ہے فریب کھانے میں

بظاہر یہ شعر زندگی کی کسی بڑی سچائی کا اشارہ نہیں مگر اسکے مفہوم کی زد سے نسل انسانی کا کوئی فرد بھی اس وقت تک نہیں نکل سکے گا جب تک کہ وہ خواب دیکھتا اور اپنے گرد انا کی خوش آئند دھند کو پھیلائے رکھتا ہے۔

بہرحال امید ایک ایسا چھلاوا ہے جو کسی فاحشہ عورت کی طرح اپنے امیدوار کو پوری طرح ناامید اور مایوس نہیں ہونے دیتا۔ حیات راس آئے یا نہ آئے زندگی سے توقعات ہمیشہ وابستہ رہتی ہیں۔

حیات راس نہ آئی اگرچہ دل میں مرے
بدل بدل کے امیدوں کا وہ لباس آئے

اگر مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی تو انسان غیر انسانی معاشرے میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ دراصل ہوا یہ ہے کہ اول اول انسانوں نے اکٹھا رہنے کی افادیت سوچ کر شہر آباد کئے اور انسانی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی۔ فطرت کے وسائل لامحدود تھے مگر انسان کے شہروں اور قصبوں

میں آباد ہونے سے زمین ہوا اور پانی کے وسائل محدود ہو گئے۔ چھینا جھپٹی کا ایسا دور شروع ہوا جس نے ایک بار پھر خود غرض حیوانی زندگی کے سارے خطرات کو کئی گنا بڑھا کر آدمی کے سر تھوپ دیا۔ حرص ہوس اور لالچ نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ہر آدمی اپنی جگہ سب کے مقابلے میں تنہا رہ گیا۔ انسان کی غیر محفوظ معاشرتی زندگی کے اسی منظر کی طرف باقی صدیقی اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں یعنی فرد بمقابلہ معاشرہ :!

ایک سے ایک ملا ہے بڑھ کر جس کے بھی نزدیک گئے
کس کس سے ہم الجھیں باقی کس کس کو بدنام کریں

پھر بھی دنیا کو مایوسی اور نا امیدی کے سیاہ بادلوں کا حاشیہ روشن دکھائی دیتا ہے اسے کسی ایسی سحر کی توقع ہے جو زود و بدیر طلوع ہو کر رہے گی۔!

جس کی ضیا ہو دسترس شام غم سے دور
دنیا کو ایک ایسی سحر کی تلاش ہے
دل کی آس مٹائے کون
جلتی شمع بجھائے کون

باقی صدیقی طبعاً حال مست درویش صفت انسان ہیں۔ وہ وضعداری اور خود داری کو کسی قیمت پر بھی قربان نہیں کرتے عزت و وقار کی زندگی کے طلب گار ہیں مگر مانگے کی جنت انہیں قبول نہیں۔

وہ داتا تو ہیں باقی
پر دامن پھیلائے کون

قومی اور ملکی سطح پر ہماری اجتماعی زندگی بھی غیروں کی دریوزہ گری سے آگے نہیں بڑھی بظاہر ہم ۱۹۴۷ء سے آج تک آزادی کے در پر سجدہ ریز ہیں۔ بھوک بیماری اور جہالت سے نجات چاہتے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے۔

بیٹھا ہوا ہوں غیر کے در پر شکستہ پا
کس منہ سے میں کہوں ترے در کی تلاش ہے

کھوکھلے نعروں اور جھوٹے وعدوں سے بہلنے والوں کی تعداد زیادہ اور بادشاہ کو ننگا کہنے والوں

کی نفری اتنی کم ہے کہ وہ کسی گنتی میں شمار ہی نہیں کیے جاتے۔ اصلیت کو کون سمجھے اور کسے سمجھائے۔

دو اک ہوں تو بات کریں
دنیا کو سمجھائے کون
ان کی بات پہ جائے کون
جھوٹی آس لگائے کون

باقی صدیقی کی غزل قومی' ملکی' معاشی' معاشرتی' اجتماعی اور انفرادی سطح کی تمام فریکو ئنسیز پر سنائی دیتی ہے۔ ہمارے ملکی وسائل لٹتے ہوئے صدیاں گزری ہیں اور اب تک ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکے زندگی سے ہماری بے نیازی نے عالمی استحصالی قوتوں کے حوصلے بڑھا دئے ہیں۔

دیکھ کر ہم کو بے نیاز حیات
حوصلہ بڑھ گیا زمانے کا
لبوں کو کھول کر یوں رہ گئے ہم
نہ کہنے پر بھی سب کچھ کہہ گئے ہم
برا ہو اے دل حساس تیرا
بہت پیچھے جہاں سے رہ گئے ہم

نوبت بہ اینجا رسید کہ ہم سارے زمانے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے سروں پر آسمان کے نیچے ایک اور آسمان تان دیا گیا ہے جس پر متمکن ارباب بست و کشاد ہر قسم کے سپید و سیاہ کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔

زمانے کی چالیں زمانہ ہی سمجھے
نہ ہم جانتے ہیں نہ تم جانتے ہو

مگر جو منظر ہمارے سامنے ہے خوش آئند نہیں اسے بدلنے کے لئے کہیں کوئی کاوش بھی نہیں اگر ہے بھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے تمام گھوڑے کسی خیمے کے اندر دوڑ رہے ہیں۔ دنوں' گھنٹوں' مہینوں اور سالوں کی مسافت کے باوصف آنکھوں کے سامنے دھواں دھواں سا ایک ہی قفس رنگ آسمان ہے۔

جوش جنوں میں زیست کے سارے نشاں جلے
حزن جلی مقام جلے کارواں جلے

اسی غفلت نے باقی مار ڈالا
کہ جب تقدیر جاگی سو گئے ہم

ہجوم رنج و غم میں کھو گئے ہم
زمانے کے مقابل ہو گئے ہم

شب تاریک کی زد سے نکل کر
سحر کی نعمتوں میں کھو گئے ہم

ہم سونے کے عادی ہیں جاگ کے پھر سو جائیں گے
نور کی شمعیں لے کر آئی صبح درخشاں کس کے لئے

آزادی کے اسی قفس نما آسمان کے نیچے انسانوں کا ایک جم غفیر غفلت کی گہری نیند سو رہا ہے جو کبھی کبھی نیم بیداری کے عالم میں نحیف و نزار آواز میں کسی صبح کے آثار کو صرف پوچھتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔

اٹھ گئے بزم سے میخوار! نہیں کوئی نہیں
ہیں کہیں صبح کے آثار! نہیں کوئی نہیں

ظلم، ادبار، ہوس، وہم، عداوت، نفرت
ہیں کوئی جینے کے آثار نہیں کوئی نہیں

باقی صدیقی بہرحال اپنے آپ سے پوری طرح مایوس نہیں

بہت نحیف سہی موج زندگی پھر بھی

بچل گئی تو کناروں کو ساتھ لائے گی
تو آنے والے زمانے کا غم نہ کر باقی
کہ رات اپنے ستاروں کو ساتھ لائے گی
ہے جھوٹ کہ سچ کسے خبر ہے
سنتے ہیں کہ ہم سنبھل رہے ہیں

غم دوراں کے ساتھ ساتھ باقی کی غزل غم جاناں کے لطیف پہلوؤں کو بھی ایسے انداز سے پیش کرتی ہے کہ فکری اور جمالیاتی دونوں سطحوں پر حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک عجیب پراسراریت ہے باقی کے ہاں غم دوراں غم دوراں ہی نہیں کچھ اور بھی ہے اور غم جاناں صرف غم جاناں نہیں انکے اشعار تراش خراش میں کسی ماہر جوہری کے تراشیدہ پہلودار موتیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جو مختلف روشنیوں میں مختلف رنگ منعکس کرتے ہیں۔ علی ہذا القیاس باقی صدیقی کی غزل انسانی طبائع پر موقع محل، موڈ اور معاشی معاشرتی موسم کے مطابق معانی کھولتی ہے۔

کچھ منتخب اشعار

دل کے لئے حیات کا پیغام بن گئیں
بے تابیاں سمٹ کے ترا نام بن گئیں
کچھ لغزشوں سے کام جہاں کے سنور گئے
کچھ جراتیں حیات پہ الزام بن گئیں
باقی جہاں کرے گا مری میکشی پہ رشک
ان کی حسیں نگاہیں اگر جام بن گئیں
چھوڑیئے بھی اب آئینے کا خیال
دیکھ پائے کوئی تو کیا سمجھے
زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں
کس کا دل ہے ہمارے سینے میں
غم کے ہیں یا ضبط غم کے ترجمان
اشک جو پلکوں پہ آکر تھم گئے
اس کے آگے کیا ہوا باقی نہ پوچھ
بارگاہ حسن تک تو ہم گئے

حسن گلشن میں فرق کیا آیا
اک کھلا پھول ایک مرجھایا

زمانہ پس گیا دو حادثوں کے درمیاں آکر
ادھر اٹھی نظر اٹھی ادھر گردش میں جام آیا

جتنا جتنا خلوص ہو جس کا
اتنا اتنا عذاب ملتا ہے

کام لیتا ہے اک جہاں باقی
ہر مصیبت کی ڈھال ہیں ہم لوگ

وہی گلشن وہی گلشن کے انداز
فقط صیاد بدلے دام بدلے

ہونٹوں سے آہیں چھینے والے ادھر تو دیکھ
ہم چپ تو ہو گئے ہیں مگر مطمئن نہیں

آ دیکھ مجھ سے روٹھنے والے ترے بغیر
دن بھی گزر گیا شب غم بھی گزر گئی

دلوں میں فاصلہ اتنا نہیں ہے
زمانہ درمیاں آیا ہوا ہے

آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میر کارواں ٹھہرے

گفتگو تلخ ہوتی جاتی ہے
کاش ایسے میں کوئی آجائے

آئی ترے قہقہوں کی آواز
یہ پھول کہاں برس رہے ہیں

اپنے گھر کی خبر نہیں باقی

وہ ستارہ شناس ہیں ہم لوگ

لوگ دنیا میں گھٹ کے مر جاتے
کوئی بندہ اگر خدا ہوتا

کیا لینا کیا دینا
ہنس کر ملنے سب سے

ذرا مسکراہٹ کا پردہ اٹھا دے
نمایاں نہیں ہیں خدوخال تیرے

دوسروں کے بھلے میں بھی اے دوست
فکر ہوتی ہے بیشتر اپنی

کیا کیا تھے اصول زندگی کے
مشکل نہ پڑی تھی کوئی جب تک

جرم کر کے بھی نہیں ہیں مجرم
اتنا اندھیر کہیں دیکھا ہے
پرواز کا وقت آگیا تھا
ہم دیکھ سکے نہ بال و پر کو

منتخب اشعار کے مطالعہ سے اس بات کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ دارورسن سے ہم نہ صرف ذاتی سطح پر جمالیاتی حظ اٹھاتے ہیں بلکہ اس کی غزلوں سے انکی تخلیق کے عہد کی سیاسی سماجی اور معاشرتی تاریخ بھی پورے اہتمام کے ساتھ مرتب کی جا سکتی ہے۔ شاعری کسی زبان کی بھی ہو اور وہ کسی زمانے سے تعلق رکھتی ہو۔ تین پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے۔ ہم اسے خالصتاً" ذاتی پسند کی وجہ سے قابل تعریف سمجھتے ہیں یا تاریخی اہمیت کی وجہ

ہے مگر عظیم شاعری ایسا پر اسرار فن ہے جس میں آفاقی اپیل موجود ہوتی ہے۔ اور اسکی فوری تفہیم ممکن نہیں ہوتی۔ داروورسن میں موجود تخلیقات 1947ء سے 1951ء تک کے عرصے میں لکھی گئی تھیں مگر انکا اثر صرف اپنے زمانہ تخلیق تک محدود نہیں ہے ان میں معنوی اور فنی سطح پر اتنی توانائی موجود ہے کہ وہ اخلاف کے اجنبی ہاتھوں میں بھی زندگی کی جمالیاتی ضرورت کو پورا کر سکیں گی۔

زخم بہار

"زخم بہار" باقی صدیقی کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں انہوں نے 1950ء سے 1959ء
نک کے عرصے میں کہی گئی غزلیں شامل کی ہیں۔ آخر میں خون پکیدہ کے عنوان سے الگ ایک
ب قائم کیا ہے جس میں مختلف اشعار درج ہیں۔ جو معنویت کے لحاظ سے اپنی جگہ منفرد ہیں اور
ہر شعر اپنی جگہ الگ ایک غزل کا حکم رکھتا ہے۔

یہ کتاب مکتبہ کارواں کچہری روڈ انار کلی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ طابع چوہدری عبدالمجید
یم اے اور مطبع کا نام اردو پریس لاہور پہلے ہی ورق پر درج ہے۔ کتابت سیف اللہ ابن محمد
حسین خوشنویس نے کی تھی کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ کتاب کے
کل صفحات 152 ہیں۔

انتساب جناب ایوب محسن کے نام ہے ساتھ ہی ایک جملے میں فاضل شاعر کی طرف سے
س امر کا مخلصانہ اعتراف ان الفاظ میں درج ہے۔ "ایوب محسن کے نام جن کے خلوص تنقید
نے میری اکثر رہنمائی کی ہے۔"

پہلے صفحے پر کتاب کا عنوان "زخم بہار" جلی حروف میں لکھا گیا ہے اور نیچے باقی صدیقی کا اپنا
نام دوسرے صفحہ کے عین درمیان میں ایک شعر ہے۔ جسے اس مجموعہ کلام کا ذیلی عنوان بھی
سمجھا جا سکتا ہے۔ اس شعر کی کتاب کے شروع میں موجودگی فاضل شاعر کے ذہن میں عصر حاضر
کے مزاج کی شاعرانہ عکاسی ہے جس سے تاریخی سیاسی' جغرافیائی اور مجموعی طور پر انسانی معاشرتی
نیات کا پتہ چلتا ہے۔

روداد گلستان کو نیا رنگ دے گیا
رستا رہا ہے خون جو زخم بہار سے

یقیناً" 1950ء سے 1959ء کا دور ملکی اور قومی سطح پر نئے آفاق کے انکشاف کا دور تھا۔
کتاب کا دیباچہ یا پیش لفظ' "سر آغاز" کے عنوان سے مختار صدیقی نے لکھا ہے۔

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جسکا نام لیتے ہی اسکے مندرجات کا اندازہ ہونے لگتا ہے
یسے بھی الفاظ چیزیں نہیں ہوتے۔ ہر لفظ اپنی جگہ کسی نہ کسی صورت حال کی علامت ہوتا ہے
ور وہ علامت مخصوص معنویت اور کسی منظر و نقش کو اپنے امکانات میں سموئے ہوتی ہے۔ اگر
فظ پہاڑ لکھا یا بولا جائے تو ذہن کے پردے پر دریا کا نقشہ نہیں ابھرتا۔ زمین کہیں تو آسمان کی

نیلاہٹوں کی طرف خیال منتقل نہیں ہو جاتا۔ علیٰ ہذا القیاس غزل کے لفظ کے اندر لطیف جذبات و احساسات کی موجودگی کا پیمان موجود ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں زندگی کے مسائل کا ذکر بھی آتا ہے تو اسے بھی غزل کی جمالیاتی ساخت اپنے ہی رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ ویسے بھی فنون لطیفہ کا یہ خاصہ ہے کہ سنگلاخ سے سنگلاخ چٹان بھی فن کے جادوئی ہاتھ سے چھو جانے کے بعد جمالیاتی حظ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

زندگی کی خوبصورتیاں ہوں یا بدصورتیاں غزل کے کینوس پر آکر رنگوں اور روشنیوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ باقی صدیقی نے غزل کو جس سطح پر پایا وہیں اس کی زلف دراز کے اسیر ہو کر بیٹھ نہیں رہے اسے اپنی ذات اور زمانے کے زاویہ نگاہ سے دیکھا اور غزل کے اشعار میں ڈھالا ہے۔ عشق و مشک اور شعر و شراب کی دنیا نے ادبی سطح پر ایسی دبیز دھند پھیلا رکھی تھی جس سے آگے دو قدم پر بھی کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا غزل کلاسیکی رویوں سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ نیو کلاسیکی رویے اور سوچ تک پہنچی تھی۔ جب باقی صدیقی نے غزل میں نئے رجحانات اور امکانات کے ابھرتے آفاق کو دیکھ لیا تھا۔ پاکستان کی تخلیق کے ساتھ شاعروں کی ایک بڑی کھیپ آئی تھی جن کا سارا زور نیو کلاسیکی رویے پر تھا وہ زبان دانی اور صرف چاشنیء الفاظ کی اسیری میں مطمئن تھے۔

ان شعراء کے خیال میں جو کچھ غزل میں کہا جاتا تھا وہ اساتذہ کہہ چکے تھے کوئی نئی بات کہنا غزل کے مزاج کے خلاف تھا۔ اکثر ادبی بحثیں اس موضوع پر ہوتی تھیں کہ فلاں لفظ غزل کا لفظ ہے یا نہیں۔ ہر نئے شاعر کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو اساتذہ کہہ چکے ہیں انہی مضامین کو اپنے انداز میں بیان کر کے لطف اٹھایا جائے اور اکثر یہاں تک کہہ دیا جاتا تھا کہ یہ مضمون میریا غالب نے اس طرح باندھا تھا اور میں نے یوں کہا ہے۔

باقی صدیقی نے الفاظ کی سطحی کیفیات کے پیچھے فکر کی گہرائیوں اور نکتہ آفرینیوں کو اپنے انداز سے غزل کا موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی صدیقی کے کلام میں ذخیرہ الفاظ کی دانستہ بھرمار نظر نہیں آتی ہے۔ انکے ہاں الفاظ صرف اپنی افادیت کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں پوری بات کہنے کا فن باقی صدیقی کو دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ اور پھر باقی صدیقی نے اسی ایجاز گوئی کے پیش نظر ہمیشہ چھوٹی بحروں کو استعمال کیا ہے۔

چھوٹی بحر میں اشعار کہنا جس محنت اور مہارت کا تقاضہ کرتا ہے اسکا صحیح اندازہ صرف بالغ نظر قاری یا کہنہ مشق شاعر ہی لگا سکتے ہیں۔ انکے ہاں لطیف نفسیاتی کیفیات کا اظہار بھی پوری

جاذبیت کے ساتھ موجود ہے بلکہ ہر سطح کے مسائل بھی اپنی تمام تر تلخی اور سنگلاخی کے باوجود غزل میں ڈھل کر فکر و فن کی خوبصورتیوں کو منعکس کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

باقی صدیقی کے کلام میں کسی کے تتبع کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے اپنی شعری دنیا آپ تخلیق کی ہے اور اس میدان میں تنہا کھڑے ہیں جیسے معانی کے کھلے سمندر کی سپاٹ سطح پر کوئی اکیلا خوبصورت بجرہ جو کھلے پانیوں میں تنہا ہی رواں ہو۔

باقی صدیقی کی شاعری میں فکر کی گہرائی پر زیادہ زور ہے جذباتی رنگ و روغن صرف محسنات کا کام کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کے چناؤ میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور ایک بار شعر کہہ کر مطمئن نہیں ہو جاتے۔ اسے ہمیشہ بناتے سنوارتے رہتے ہیں۔ مثلاً "زخم بہار" کے صفحہ نمبر 74 پر جو غزل درج ہے۔ اسکا چوتھا شعر تھا۔

پھول ہیں اسکے باغ ہے اس کا
دسترس جس کی باغباں تک ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے سے باقی صدیقی مطمئن نہیں تھے۔ کتاب میں یہ شعر اسی طرح چھپ تو گیا مگر اسے پھر بھی بدل کر دم لیا۔ مصرعے میں جو تبدیلی باقی صدیقی نے کتاب چھپ جانے کے بعد کی اسے پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس تبدیلی کو کیوں ضروری سمجھتے تھے۔

تبدیل شدہ مصرع کچھ یوں ہے۔

باغ اس کا ہے پھول اسکے ہیں
دسترس جس کی باغباں تک ہے

اس قسم کی تبدیلیاں وہ اپنے اشعار میں آخر دم تک کرتے رہتے تھے اسی محنت اور ہمہ وقت کاوش کا نتیجہ ہے کہ باقی صدیقی کے کلام میں وہ شگفتگی دیکھنے میں آتی ہے۔ جو انکی آواز کو شعری نگار خانے میں منفرد مقام دلا گئی ہے۔

باقی صدیقی کا انداز شعر گوئی کچھ ایسا منفرد ہے جس کے موجد بھی وہ خود ہیں اور خاتم بھی ان کی غزل اپنے پڑھنے والے میں ایسا ذوق سلیم پیدا کرتی دیتی ہے جس کی تسکین ان ہی کے کلام سے ممکن ہوتی ہے۔ ان کی غزل کے اشعار بظاہر اتنے سادہ اور سہل دکھائی دیتے ہیں اور بے ساختہ نظر آتے ہیں گویا ہر شخص انہیں خود بھی کہہ سکتا ہے مگر ان کے ہر شعر کی خاموش سطح اپنے اندر سمندر کی سی گہرائی لیے ہوئے ہے وہ کہتے کہتے اچانک کوئی اچھا شعر نہیں کہہ جاتے ان

کی غزل کے ہر شعر کا دامن مفہوم و مطالب کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ کوئی نہ کوئی صورت حال ہر شعر کی لفظیات سے جھانکتی نظر آتی ہے ان کے کسی شعر کے ابھرے معانی جان لینے سے طبیعت بھر نہیں جاتی ذہن اس کی پرتیں بدل بدل کر مزید امکانات کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی غزل کے اشعار پہلو دار موتیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کے چھوٹے سے چھوٹے پہلو سے بھی ایک جہان معنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتا دھڑکتا محسوس ہوتا ہے ایک پر اسراریت ہے جو ان کے پورے کلام میں جاری و ساری نظر آتی ہے ۔ ان کی ہر بات میں امکانی مطالب کا لا متناہی سلسلہ پوشیدہ ہوتا ہے اس لئے ہم ان کے کسی شعر کو فکر کے کسی ایک زاویے سے منسوب کر کے محدود نہیں کر سکتے اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً" وہ زاویہ واقعہ یا پہلو تو وقعت پالے گا مگر باقی صدیقی کے شعر کو معنوی لحاظ سے محدود کر دے گا۔ ان کے اشعار سے اس قسم کی ہنگامی افادیت حاصل کرنے کی کاوش گلاس میں ہاتھی ڈالنے کے مترادف ہو گا۔●

باقی صدیقی کو ان کے ہمعصر شعراء کی صف میں کھڑا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور اگر ان کا بحیثیت شاعر کسی اور سے مقابلہ کیا جائے تو یہ out of class comparison ہو گا باقی صدیقی کو پرکھنے کے لیے صحیح اور معقول طریقہ یہ ہے کہ باقی صدیقی کو ان کے اپنے ہی قد کاٹھ پر جانچا جائے ویسے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر شاعر ہر وقت اپنی شاعرانہ بلندیوں پر موجود نہیں ہوتا۔ وہ مقامات بہت کم ہوتے ہیں جو کسی شاعر کو فنکارانہ بلندیوں پر فائز دکھاتے ہیں۔ بہرحال باقی صدیقی کا کلام ایسا انتخاب ہے کہ اس کا کوئی پہلو کہیں دبتا نظر نہیں آتا۔

اظہار کا ایک منفرد سلیقہ ہے جو ان کی غزل کے اشعار میں اپنی علیحدہ فضا قائم کئے ہوتا ہے۔

موج آتی ہے پلٹ جاتی ہے
کون سی بات نہیں ساحل میں

پوچھتے ہیں وہ حال دل باقی
یہ بھی گویا مرے بیاں تک ہے

بے نیازی سی بے نیازی تھی
اپنے گھر کو نہ اپنا گھر جانا

لوگ نفرت کا گلہ کرتے ہیں

ہم وطن سے نہیں جانے پاتے

معنوی لحاظ سے ان اشعار میں سے ہر شعر کی اپنی خاموش سطح کے قریب ہی ایسا تاثر موجود ہے جو قاری کو اپنی تاثیر سے لذت اٹھانے کے امکانات کی طرف بلاتا ہے۔

تنگ بستی ہے سکوت ساحل
کوئی طوفاں کو ادھر لے آئے

انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح طور پر ہمیں چونکاتی ہے کہ جنگ و جدل سے خلاقی قدروں میں اضافہ اور استحکام آتا ہے جبکہ امن سے corruption اور بے راہ روی پھیلتی ہے کھڑے پانی میں کیڑے پڑنے لگتے ہیں یہی بات باقی صدیقی کے اس شعر سے منعکس ہوتی ہے۔

دست گل چیں ہے کہ شاخ گل ہے
جب اٹھے اک گل تر لے آئے

اس شعر میں معنی کا پورا زور گلچیں کے لفظ پر ہے اور گلچیں اس شعر میں استحصالی ظالم قوتوں کی علامت ہے جو ہر طرح کے وسائل حیات اور نشوونما کے ذرائع پر بلا شرکت غیر قابض و حاوی رہتی ہیں اور یہ صورت حال ایک دن ایک صدی یا ایک دو افراد کو پیش آنے والا سانحہ نہیں پوری انسانیت ہر صدی میں اس استحصالی صورت حال کی زد پر رہتی ہے۔

بظاہر باقی صدیقی کی غزل کا یہ شعر گل اور شاخ گل کے خوبصورت الفاظ کا مجموعہ نظر آتا ہے مگر اس کی ثانوی سطح دوسری خواندگی پر کھل کر سامنے آتی ہے جب ذہن "گلچیں" کی موجودگی اور اس کے کردار کی طرف مبذول ہوتا ہے

اپنی حالت نہیں دیکھی جاتی
ہم کو حالات کدھر لے آئے

یہ شعر بھی اپنی معنویت اور مخصوص طرز اظہار کی وجہ سے صاف اور سادہ دکھائی دیتا ہے مگر اس کے دوسرے مصرعے میں "حالات" منہ زور اور ہم بحیثیت قوم پر اندافتہ حالت میں سامنے آتے ہیں۔ ذرا غور کریں تو مطلب کی مزید پرتیں کھلنے لگتی ہیں۔ حالات صرف ان ہی کو اپنی گرفت میں جکڑ کر بے بسی کے عذاب میں مبتلا کر سکتے ہیں جو اپنے معاملات کو حالات کے سپرد کر کے اتفاقات اور معجزات کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔

یہ شعر بتا رہا ہے کہ ہم ادھر خود آئے نہیں ہمیں حالات لے آئے ہیں۔ بے اندازگی کی بد ترین مثال ہے۔ باقی صدیقی کے ہر شعر کی سطح اسی طرح خاموش دکھائی دیتی ہے جبکہ ان کے معانی ہمیشہ گہرے اور اہم ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ باقی صدیقی کے کلام کی بے پناہ پختگی اپنے اندر دلوں کو موہ لینے والی جاذبیت رکھتی ہے جس طرح کوئی عقلمند شخص اپنی جیب میں موجود رقم کو صرف اس وجہ سے خرچ نہیں کر ڈالتا کہ وہ اسکے پاس موجود ہے۔ وہ اسے صرف کرنے کے لئے کوئی معقول جواز دیکھتا ہے۔ اسی طرح باقی صدیقی الفاظ کو بھی انتہائی کفایت شعاری سے استعمال میں لاتے ہیں۔ تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنے کا فن باقی صدیقی کو خوب آتا ہے۔

اٹھتے اٹھتے اٹھیں گے پردے
صدیوں کا غبار درمیاں ہے

مطلب کے لحاظ سے باقی صدیقی کا ہر شعر اپنے اندر آفاقیت کو سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ ہمیشہ مخصوص معانی گھٹیا اور محدود ہوتے ہیں۔ عظیم مطالب آفاقی اور لامحدود جو ہنگامی مقامی اور انفرادی دلچسپیوں سے ماوراء اپنی دنیا الگ بسائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ہر پہلو سے جمالیاتی حظ کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

ہر کام ادھورا نظر آتا ہے جہاں کا
ہر سمت تری نیم نگاہی کا سماں ہے

باقی صدیقی نے یہ شعر کہہ کر جہان رنگ بو کا عجب نقشہ کھینچا ہے اور یہ انسانی حوالے سے درست بھی ہے۔ جو شے بھی اس کائنات میں موجود ہے۔ اسکے رنگ ادھورے ہیں اسکی تخلیق ادھوری ہے مثلاً" خوبصورت گلاب کا پھول رنگ بھی رکھتا ہے تازگی بھی اور خوشبو بھی مگر اسکی یہ خوبیاں دیکھے محسوس کئے اور سونگھے بغیر کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ علی ہذ القیاس چینی میٹھی ہوتی ہے مگر جب وہ پلیٹ میں پڑی ہو تو آپکو اس وقت تک میٹھی نہیں لگتی جب تک اسکے کچھ دانے پلیٹ سے اٹھا کر اپنی زبان پر نہیں رکھتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسکی مٹھاس اس وقت تک ادھوری ہے جب تک اسے کوئی چکھنے والا موجود نہ ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاں Half Created ہے۔

بہرحال باقی صدیقی نے بڑے سادہ اور روزمرہ کے الفاظ میں جبلی انسانی حیثیت اور مادی وجود کائنات کے مابین رشتے کو انفرادی انداز سے تلاش کیا ہے۔ اسی شعر سے ملتا جلتا ایک اور شعر

ملاحظہ فرمایئے۔

اپنے زخموں میں چھپے جاتے ہیں
کوئی دیکھے تو نظر آتے ہیں

مسئلہ شمولیت کا ہے روحانی' جذباتی یا مادی روابط کے بغیر کوئی منظر نہیں بنتا۔ اور جو منظر وجود میں آجائے اسکے لئے نظر کی ضرورت اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنا کہ خود منظر۔ باقی صدیقی نے زخموں میں چھپنے کا واقع اپنے استعاراتی اظہار کے سہارے بیان کیا ہے۔ زخموں سے مراد گونا گوں مسائل حیات بھی ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے فرد معاشرے سے کٹ کر رہ جاتا ہے وہ سطح زمین پر ہر لمحہ کسی نہ کسی مقام پر موجود تو رہتا ہے مگر نظر نہیں آتا جب تک کسی کو اسکی ضرورت نہ پیش آجائے۔ کوئی دیکھے تو نظر آتے ہیں سے مراد یہ ہے کہ صرف اسے نظر آتے ہیں جسے ہماری ضرورت ہو اور صرف اس وقت نظر آتے ہیں جب کوئی دیکھے۔

باقی صدیقی نے زندگی کو ٹوٹ کر چاہا ہے اور نہ توڑ کر دیکھا ہے بلکہ انہوں نے زندگی کے گرم و سرد کو چکھا اور اسکی حدت کو اپنے گالوں پر آگ کے دہکتے شعلوں کی طرح محسوس کیا ہے۔ باقی صدیقی نے اس کائنات کو کرچیوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا اسکا سراپا دیکھا ہے اور اسکے اثرات کو اپنے خون میں کشید کر کے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فارسی یا اردو زبان کے بنے بنائے محاورات و استعارات کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے وہ اپنے وجود کی مٹی سے اپنا جہاں آپ تیار کرتے ہیں۔ جسکے ذرے ذرے سے داستان حیات منعکس ہوتی ہے۔

اس قدر تلخ تھی روداد حیات
یاد آتے ہی بھلا دی ہم نے

ان کے اشعار عکس در عکس آئینے ہیں جن کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ سیاست معاشرت' محبت' عداوت' دوستی اور دشمنی جن جن پتھروں پر چل کر زندگی کرنا پڑتی ہے ان کے زخم جابجا نشان عبرت بن کر انسانی تجربات کے امکانی نفسیاتی ہیولوں کو اعصاب پر اس طرح مرتب کرتے جاتے ہیں جیسے کسی کھلی کتاب کے اوراق آپ ہی آپ الٹتے اور تصویریں دکھاتے جاتے ہیں۔ باقی صدیقی زبان کی بیساکھیوں پر چل کر اپنے شعر کی دنیا میں داخل نہیں ہوتے۔ شعر کا خمیر ان کے ذاتی تجربات سے اٹھتا ہے اور بڑی بے ساختگی سے باقی کی اپنی زبان میں ڈھل کر آسودہ ہو جاتا ہے۔ خیال اور الفاظ ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہیں۔ اسکے درمیان ہم آہنگی کا ایسا بے مثال خاکہ تیار ہو جاتا ہے جس سے خالصتاً" باقی صدیقی کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ باقی کی زبان

منفرد ہے' وہ حالات و معاملات و واردات کو جس پہلو سے دیکھتے ہیں وہ منفرد ہے۔ اسی انفرادیت کا شدید احساس باقی صدیقی کے گفتہ کو عصری شعری رواج سے الگ اپنی ایک مختلف روایت قائم کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ باقی اپنے اس تجربے کو ادھورا نہیں چھوڑتے اسے ایسے مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں سے آگے کا سفر ہر کسی کے بس کی بات نہیں ثبوت یہ ہے کہ باقی کا اسلوب آج بھی وہیں رکا کھڑا ہے نہ کوئی ہم عصر انکے ساتھ اس طرف نکلا تھا نہ انکے بعد کوئی انکے اسلوب کی راہ پر چلنے کی جسارت کر سکا ہے۔

مدعا خامشی تک آپہنچا
اب نگاہوں سے بات کیا ہو گی
ہم سے بھی زمانہ آشنا ہے
ہم بھی ترے ہم نفس رہے ہیں
ہم پہ کیجئے نہ بھروسہ باقی
ہم خیال اپنا بھی کم رکھتے ہیں
چپ رہیں ہم تو گلے ہوتے ہیں
کچھ کہیں تو کوئی سنتا بھی نہیں
واقف رنگ دہر ہو کر بھی
تجھ سے ملتے ہیں کس خوشی سے ہم
دیکھ کر رنگ تیری محفل کا
ہم نے غیروں کی طرح باتیں کیں

باقی صدیقی کے یہ اشعار صرف میڈیم کی شعبدہ کاری نہیں محض لسانی تجلیات کی مرصع کاری نہیں۔ زندگی میں عملاً" شمولیت سے حاصل ہونے والے براہ راست ذاتی تجربات کا نچوڑ ہیں۔

اگر ان اشعار کی خاموش سطح پر نظر ڈالیں تو کہیں کچھ بگاڑ نظر نہیں آتا۔ ہر طرح سے ہر طرف سب ٹھیک ہی دکھائی دیتا ہے۔ اور اگر ان کے معانی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو ایک ایک لفظ کے اندر گہرے مطالب کا ہمہ جہت سلسلہ جھائی دیتا ہے۔ یہی سادگی و پر کاری باقی صدیقی کا فن ہے جو انہوں نے کہیں سے بنا بنایا نہیں پا لیا تھا عمر بھر کے زخموں سے رستے لہو کو جلا کر حاصل کیا تھا۔

روداد گلستاں کو نیا رنگ دے گیا
رستا رہا ہے خون جو زخم بہار سے
ضو صبح کی چھو رہی ہے دل کو
ہر چند کہ رات درمیاں ہے
نیند چبھنے لگی بند آنکھوں میں
جب چراغوں کا دھواں یاد آیا
اک کرن اس طرف سے گزری ہے
ہو رہی ہے کہیں سحر ساقی
اے باد صبا نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے
یہ غم دل یہ شب تنہائی
سوچتے سوچتے سو جاتے ہیں
کس طرح کٹے گی رات باقی
دن تو کسی طور سے گزارا

باقی صدیقی روداد حیات کچھ اپنے ہی انداز سے رقم کرتے ہیں اور ہر لمحہ انکی دوررس نظر مآل کار پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ اوپری رنگوں اور روشنیوں کی چکا چوند میں گم ہو کر نہیں رہ جاتے وہ آنکھیں بند کر کے صرف اپنے خون کی لذت لینے کے عادی نہیں۔ بالغ نظری باقی صدیقی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں موجود ہر شے کی انتہائی صورت اور انتہائی تازگی و توانائی کو مجموعی وجودی شکل میں رکھ کر دیکھنے پر اکساتی رہتی ہے۔ آگے انکا فن ہے جو تاثرات کو شعر کی ہفت خواں سے گزارتا چلا جاتا ہے۔

خشک پتوں پہ سرشک شبنم
اور کیا حاصل رنگ و بو ہے
ہے فرصت زہر خند کس کو
پھولوں کو صبا نہ گدگدائے
شاخوں میں تھی دبی ہوئی شاید خزاں کی آگ
گلشن بھڑک اٹھا ہے نسیم بہار سے
روش روش یہ سلگتے ہوئے شگوفوں سے

کبھی کبھی ہمیں اندازہ بہار ہوا
جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے
آگ گلشن میں لگی تھی باقی
فصل گل تھی کہ خزاں یاد نہیں
باد خزاں کا قرض ہے یا لغزش بہار
کچھ پھول ٹوٹ کر مرے داماں میں آئے ہیں

باقی صدیقی کی کتاب "زخم بہار" میں شامل غزلیات انکی منتخب غزلیات ہیں۔ اور ان میں اشعار کثیر تعداد میں ایسے بھی موجود ہیں جو باقی صدیقی کی شاعرانہ عظمت کے بلند ترین زینے پر پہچان بناتے ہیں۔ باقی صدیقی کے اشعار میں زمان و مکان گونجتے ہوئے صاف سنائی دیتے ہیں۔

ہوئے آزاد لیکن آرہی ہے
قفس کی بو ابھی تک بال و پر سے

باقی صدیقی کے نزدیک غلامی لباس نہیں جو آسانی سے پہنا یا اتارا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی رویہ ہے جو آزادی کے کھلے آسمان تلے بھی بعض اذہان کو زنجیروں میں جکڑے رکھتا ہے۔ غلامی چہروں پر جمایا ہوا غازہ نہیں ہوتا بلکہ خون کے ناطے جبلت میں سرایت کیا ہوا زہر ہوتا ہے جسکی بوباس کبھی پوری طرح زائل نہیں ہوتی۔ جس طرح آزادوں کو غلام بنانا ظلم ہے اسی طرح بعض غلاموں کو آزاد کرنا بھی زیادتی اور ناانصافی ہے۔

ایک دیوار کی دوری ہے قفس
توڑ سکتے تو چمن میں ہوتے

مگر یہ دوری صدیوں کی دوری ہے۔ اور دیوار صرف دیوار نہیں قفس کی دیوار ہے اسے توڑنے کے لئے مادی وسائل سے زیادہ انسانی اقدار اور معاشرتی عالی رویوں کی ضرورت ہے۔ مسائل سب جانتے ہیں مگر حل کسی کو معلوم نہیں۔ معاملہ صرف دیوار توڑنے کا نہیں اگر صرف دیوار توڑنے کا سوال ہوتا تو یہ کام بہت سی اقوام نے عملاً" بارہا کر کے دیکھ لیا ہے۔ قفس کی دیوار قائم تھی تو قفس کا رقبہ محدود تھا۔ دیوار ٹوٹنے سے قفس کی دیواریں انسانی روح کے اندر تک پھیل گئیں۔

جب تک قدرت کے لا محدود وسائل کو شہروں قصبوں قوموں ملکوں اور افراد کے چند ہاتھوں

میں محدود اور منقسم رکھا جائے گا آقا و غلام کی داستان کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

خوشبو ہم تک آ نہ سکی
پھول کچھ اتنی دور کھلے

پھول کھلتے رہے گے اور محرومیاں بڑھتی رہیں گی جب تک قومیں قوموں کے تحفظ کے لیے کوشاں رہیں گی اس وقت تک اپنے ہی ہاتھوں قتل اور مرتی رہیں گی۔ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت اسوقت تک جاری رہے گی جب تک عقل انسانی بلوغت کی منزل پر پہنچ کر ذاتی قومی اور وطنی (تحفظات) سے آگے کی بات نہیں سوچے گی اور وہ آگے کی بات یہ ہے کہ ہر قوم اپنی ذات کی حفاظت کے بجائے سارے عالمی وسائل کو نسل انسانی کے تحفظ کے لئے مختص کر دینے کا حوصلہ پیدا کرے اور عالمی فلاحی معاشرے کی تشکیل و تکمیل خالصتاً" انسانی بنیادوں پر ہونے لگے۔ ورنہ لاٹری کا موجودہ عالمی معاشی نظام انسانوں کو حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا رہے گا۔ ذرائع رزق و نشوونما پر چند ہاتھوں کی اجارہ داری قائم رہے گی اور پھر یہ شکایت نسل انسانی کے لئے پوری معنویت کے ساتھ جوں کی توں۔

میرے ذوق نظر کا کیا ہو گا
چند پھولوں میں بٹ گئی ہے بہار

باقی صدیقی کی زندگی اور معاملات زندگی پر گہری نظر ہے وہ اپنے گردوپیش ہی سے اپنے موضوعات چنتے ہیں اور انھیں فن کی کٹھالی میں پگھلا کر پہلے کندن بناتے ہیں اور پھر شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ بات صرف بات نظر آتی ہے کسی قسم کی کاریگری کا احساس نہیں ہوتا جس کی لذت کے ساتھ عرفان ذات و کائنات بھی قاری کے دل کو مسحور کرتا چلا جاتا ہے۔

اس طرح باقی صدیقی کے اشعار vicarious یا غیر ذاتی تجربہ کا انمول خزانہ ثابت ہوتے ہیں جس تک رسائی سے جمالیاتی حظ کے ساتھ ساتھ ذہنی عضلات کی پرداخت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس مسرت کا ذریعہ بنتا ہے جو اپنے اندر افادیت بھی رکھتا ہے اہمیت بھی۔

جھک گئی آنکھ عرض حال کے ساتھ
بات جاتی رہی سوال کے ساتھ
دل ٹھہرتا نہیں ہے سینے میں
جانے کیا بات ہونے والی ہے

جانے وہ چپ رہے ہیں کیوں ورنہ
بات کرنے کے سو بہانے ہیں

روشنی میرے مقدر میں کہاں
دور سے دیکھتا جاتا ہوں چراغ

ہم ذرے ہیں خاک رہ گزر کے
دیکھو ہمیں بام سے اتر کے

فسانہ خواں کوئی دنیا میں مل گیا جسکو
اسی کا ذکر فسانوں میں بار بار ہوا

کوئی نغمہ تو در سے پیدا ہو
آپ ہوں یا ہوا کا جھونکا ہو

اس طرح ہو گئے جدا جیسے
راہ میں یوں ہی مل گئے تھے ہم

آرزو راستے میں چھوڑ گئی
ہم ہیں اور زندگی کے پیچ و خم

پستیاں بھی گریز کرنے لگیں
کس بلندی سے گر رہے ہیں ہم

انہی مجبوریوں نے مار ڈالا
کہ تیری ہر خوشی میری خوشی ہے

ترے بغیر نظر کا یہ حال ہے جیسے
تمام شہر کی شمعیں کسی نے گل کر دیں

تم زمانے کی راہ سے آئے
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا

دلوں میں فاصلہ اتنا نہیں ہے
زمانہ درمیاں آیا ہوا ہے

زیست کس مرحلے پہ آپہنچی

وضعداری کا بھی سوال گیا

زخم آئینہ بنے جاتے ہیں
حادثے سامنے لاتے ہیں مجھے

اٹھتے اٹھتے . اٹھیں گے پردے
صدیوں کا غبار درمیاں ہے

حادثہ ہے کوئی ہونے والا
دل کی مانند دھڑکتی ہے زمیں

رسم سجدہ بھی اٹھا دی ہم نے
عظمت عشق بڑھا دی ہم نے

آپکو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میر کارواں ٹھہرے

جب سے دل میں ترا غم رکھتے ہیں
خود سے ہم رابطہ کم رکھتے ہیں

باقی صدیقی چھوٹی بحر میں اپنے آپ کو زیادہ آسودہ سمجھتے ہیں۔ یہ انکی ذاتی فنی مہارت کی بات ہے ورنہ لمبی مترنم بحریں شعر گوئی کے لئے زیادہ موزوں بھی ہوتی ہیں اور آسان بھی۔ باقی اس لحاظ سے بھی منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لئے ہمیشہ آسانیاں ڈھونڈنے کے بجائے ادق اور سنگلاخ راستے اختیار کئے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور غور کیجئے اس سے زیادہ اور اختصار کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اشعار فعلن فعولن کے وزن پر ہیں جس میں مضمون آفرینی اور شعریت پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ محض مفہوم ادا کر دینا اور بات ہے۔

چیں بر جبیں ہو
کتنے حسیں ہو
جیسا سنا تھا
ویسے نہیں ہو

اتنی خوشی
گویا نہیں ہو
سوچو تو باقی
سب کچھ نہیں ہو

یہ ہے باقیؔ صدیقی کا کمال فن جو انہیں دوسرے ہم عصروں سے ممیز کرتا ہے۔ اور اخلاف کے اجنبی ہاتھوں میں بھی باقیؔ صدیقی کو حیات بعد از موت کی ضمانت دیتا ہے۔

کشتیاں ٹوٹ گئی ہیں ساری
اب لئے پھرتا ہے دریا ہم کو

"کتنی دیر چراغ جلا"

"کتنی دیر چراغ جلا" باقی صدیقی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ انکے چار شعری مجموعے انکی زندگی ہی میں چھپ گئے تھے۔ جام جم اردو نظموں اور قطعات پر مشتمل تھا جو ہر جگہ دستیاب ہیں۔ دارورسن' زخم بہار اور کچے گھڑے شائع ہو چکے تھے جب باقی صدیقی نے 1972ء میں انتقال کیا۔ "کتنی دیر چراغ جلا" ان کی وفات کے بعد شائع کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ اسے ادبی تحریک راولپنڈی نے شائع کیا تھا۔ ناشر رشید نثار ہیں ایک ہزار کی تعداد میں شائع کی گئی تھی۔ کتاب کے جملہ حقوق بحق اصغری خانم محفوظ تھے۔ اصغری خانم باقی صدیقی کی چھوٹی ہمشیرہ تھیں جو ان کی وفات کے بعد تک حیات رہیں۔ کتاب معنون بھی انہی کے نام ہے۔ کتاب کا سرورق باقی صدیقی کے ایک ہم عصر شاعر ڈاکٹر فضل الرحمن اشک کی دختر ناہید وقار کا شاہکار ہے۔

محترمہ ناہید وقار' کراچی کی ممتاز فنکارہ ہیں۔ کتاب کا دیباچہ جناب محبوب اختر کا لکھا ہوا ہے۔ جو انہوں نے 8 فروری 1977ء کو راولپنڈی میں تحریر فرمایا تھا۔

باقی صدیقی جب زندہ تھے تو کوئی ادبی محفل اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی تھی جب تک باقی صدیقی اس میں شامل نہ ہوں لیکن وفات کے بعد انکے کلام اور نام پر گمنامی کی گرد تہہ در تہہ جمنا شروع ہوئی تو باقی صدیقی کے چاہنے والے کچھ دوستوں نے مل کر ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں افضل پرویز' جمیل ملک محبوب اختر اور رشید نثار شامل تھے۔ انہوں نے باقی صدیقی کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ اس کمیٹی کا نام ادبی تحریک راولپنڈی رکھا گیا۔

"کتنی دیر چراغ جلا" میں شامل پہلی تحریر کے ساتھ ڈاکٹر رشید نثار اور ڈاکٹر بشیر سیفی کے نام درج ہیں۔

باقی صدیقی کے غیر مطبوعہ کلام کا جو انتخاب اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے اس سے باقی صدیقی کی غزل میں ارتقائی اٹھان نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کلام انکی کتاب زخم بہار کے بعد کا ہے۔

باقی صدیقی سچائی اور سادگی کو ساتھ لے کر چلے تھے وہ زمین کو زمین اور آسمان کو آسمان دیکھنا چاہتے تھے جب تک وہ معصومیت کے ساتھ اپنے گردو پیش سے حقیقت پر مبنی توقعات وابستہ رکھ سکے۔ مطمئن رہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے چہرے رنگ بدلنے لگے اور پھر یوں ہوا کہ ہر شے جو نظر آتی تھی ویسی نہ رہی درخت تھے تو سایہ نہ تھا۔ پھول تھے تو خوشبو نہ تھی۔

سوچ کر کیا بات آبیٹھے ہو تم
ان درختوں کا کوئی سایہ نہیں
دھوپ کا رخ دیکھ کر چلتے ہیں لوگ
کوئی اپنے سامنے آتا نہیں

جب کانچ کے ٹکڑوں نے ہیروں کی جگہ اپنا لی تو باقی صدیقی ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ ایک کرب تھا جو انکی روح تک اتر گیا۔ ایک اذیت تھی جو جان میں جذب ہو گئی ایک ٹیس تھی جو رونگٹے رونگٹے میں سرائت کر گئی۔ اسی منظر اور پس منظر کے عکس انکی غزل میں جھلملاتے ہیں اور ایسی ایسی تصویریں دکھائے چلے جاتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر ذہن کے وہ خلیے بھی حرکت میں آنے لگتے ہیں جو عام طور پر خوابیدہ ہی رہتے ہیں۔ باقی کی غزل Disillusionment کی شاعری ہے پردہ اٹھنے کی شاعری ہے۔

ہوش آیا تو تاریکی میں تھے باقی
کتنی دیر چراغ جلا معلوم نہیں
پہچان سکے نہ خود کو باقی
بیٹھی جب گرد رہگزر کی

باقی صدیقی کی غزل کلاسیکی شاعری سے براہ راست متاثر نہیں نہ ہی اس پر کسی ہم عصر تحریک کا اثر ہے یہی وجہ ہے انکی شاعری گل گشت سے زیادہ کھنڈر کی سیر دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کا عکس نہیں خود زندگی ہے۔ باقی صدیقی نے غزل کو مصنوعی چھتوں اور بارگاہوں کے سائے سے نکال کر کھلے آسمان کے نیچے لا کھڑا کیا ہے۔ یہاں باقی صدیقی جو آوازیں سنتے ہیں وہ ڈرائنگ روم میں کہاں۔

ڈسنے لگی فاختہ کی آواز
کتنی سنسان دوپہر ہے

باقی نے زندگی کے ہاتھوں طرح طرح کے دکھ جھیل کر یاقوت اگلے ہیں۔

شعر کا روپ بدل کر باقی
دل کے کچھ زخم زباں پر آئے

انکے بہت سے ہمسفر تھک ہار کر گرد کی طرح بیٹھ گئے چہرے بدل لئے یا آوازیں۔ مگر باقی

صدیقی نے پورے اعتماد سے ہر صورت حال کا دلیرانہ مقابلہ کیا ہے۔ انکے لہجے میں تلخی آگئی مگر سچ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

زخموں کو پڑے چاٹ رہے ہیں گھر میں
بات کرتے تھے زمانے سے جو تلوار کے ساتھ

باقی صدیقی تلخ نوائی پر شرمندہ نہیں۔ البتہ اس میں وہ طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ جو کسی فرض کو نبھانے پر ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے شاعری کو گفتگو کے لہجے سے آشنا کیا ہے۔ انکی غزل گاتی گنگناتی باتیں کرتی ہوئی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ باقی صدیقی روسی کمیونزم کے قائل تھے نہ چینی اشتراکیت کے وہ خالص قرآنی مساوات کے داعی تھے جس میں رزق کے ذرائع کا مالک اللہ کے سوا کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔

لوگ دنیا میں گھٹ کے مر جاتے
کوئی بندہ اگر خدا ہوتا
ہر نظر میں عکس دوراں دیکھ لو
کون ہے کتنا پریشاں دیکھ لو
کتنے رنگوں سے ہے دنیا کا وجود
کتنے پردوں میں ہے عریاں دیکھ لو
کس قدر آباد ہے شہر حیات
اور دل ہیں کتنے ویراں دیکھ لو

باقی کو اپنی بات کو سب کی بات بنا دینے کا فن آتا ہے۔ باقی ان شاعروں میں سے نہیں جن کی آواز گلے سے ہی نہیں نکلتی۔ باقی کا کھرا اور سچا لہجہ قاری کے دل کے نہاں خانے کے اندر تک گونجتا ہے۔

یہی جرات اور بے ساختگی باقی صدیقی کی غزل کی پہچان ہے۔

دشت حالات کے چھانے ہیں بہت
ہم نے وعدے ترے مانے ہیں بہت
دل ابھی اور بھی ویراں ہونگے
شہر ابھی اور بسانے ہیں بہت

باقی صدیقی نے دکھی انسانیت کی اذیتوں کو محسوس کیا ہے۔ اور زمین کے ذرے ذرے کو

اسکے قریب جا کر دیکھا ہے۔ انہوں نے ہر سطح سے زندگی کے زخموں کو سمیٹا ہے اور پھول بنا کر غزلیات کی شکل میں لوٹا دیا ہے۔ باقی صدیقی کو پڑھنے سے اس بات کا عرفان جاگتا ہے کہ معاشرے میں شاعر ایک ایسے میٹر کی طرح ہوتا ہے جو زندگی کے دکھ سکھ میں نہ صرف شامل رہتا ہے بلکہ جو کچھ دیکھتا ہے اور سہتا ہے اسکے اثرات کو اشعار کی شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو شاعر ان جوہریوں کی طرح ہوتے ہیں جو ہمارے ہی گردو پیش سے سنگریزوں کو چن لیتے ہیں اور انہیں اپنے فن کی ٹکسال میں منفرد انداز میں ڈھالتے' ترتیب دیتے اور صیقل کر کے ہمیں ایسی شکل و صورت میں لوٹا دیتے ہیں کہ وہ ہر پہلو سے لو دینے لگتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ موتیوں کی شکل میں ڈھلے یہ سنگریزے مختلف رنگوں اور رشنیوں میں مختلف رنگ اور روشنیاں منعکس کرتے ہیں۔ ان فن پاروں کی چمک عارضی اور ہنگامی نہیں ہوتی وقت گزرنے کے ساتھ اخلاف کے اجنبی ہاتھوں میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود رہتے ہیں اور پرانے نہیں ہوتے۔

شام و سحر کے رنگ نمایاں نہیں رہے
یا ہم شریک دیدۂ حیراں نہیں رہے

کیوں گریزاں ہیں منزلیں ہم سے
نہ چلے ہم کہ رہنما نہ چلے

کس نے کھینچی حیات کی تصویر
ہاتھ میں جام پاؤں میں زنجیر

ہر نظر ہے عکس دوراں دیکھ لو
کون ہے کتنا پریشاں دیکھ لو

کس قدر آباد ہے شہر حیات
اور دل ہیں کتنے ویراں دیکھ لو

باقی صدیقی نے ایسی ایسی نازک انسانی کیفیات کو بھی چھونے کی کوشش کی ہے جنہیں عام طور پر محسوس تو سب کرتے ہیں مگر اظہار کے لئے ضروری موضوعات خیال نہیں کرتے۔

راس آئی نہیں تنہائی بھی

اور ہر شخص سے بیزار بھی ہیں
شام و سحر کے رنگ نمایاں نہیں رہے
باہم شریک دیدہ حیراں نہیں رہے
کیوں لفظ بے صدا ہوئے' کیوں حرف بجھ گئے
کیا ہم کسی فسانے کے عنواں نہیں رہے

محرومی کا احساس طبیعت میں شدید قلق پیدا کرتا ہے۔ انسان کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہتا۔ بے رنگی کی ایک اذیت ناک نفسیاتی الجھن اسے معاشرے سے عضو معطل کی طرح کاٹ دیتی ہے۔ پھر اسکے لئے ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔

کھوکھلے پن کا احساس سناٹے کی گونج بن کر تنہائی کو عذاب بنا دیتا ہے۔ اور یہی اندر سے خالی ہونے کا درد دل کے شور میں ڈھل کر صاف سنائی دینے لگتا ہے۔

کون اندر سے اٹھ گیا باقی
شور دل کا سنائی دیتا ہے

دیکھ لیجئے باقی صدیقی بات کو کن نازک سطحوں تک لیجاتے ہیں۔ اور مفہوم کس قدر (like) (Life) اور کتنا حقیقت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ کسی کمرے سے اگر سارا سازو سامان اٹھا کر باہر نکال دیا جائے تو وہ کمرہ بھی ذرا ذرا سی آواز پر بولنے لگتا ہے۔ مگر یہ آواز کسی کی موجودگی کی نہیں غیر موجودگی کی علامت ہوتی ہے۔

بے سمت سفر کا عذاب وہی محسوس کر سکتا ہے۔ جو مسلسل سفر میں بھی ہو منزل اور رہگذر کی پہچان بھی نہ رکھتا ہو۔

منزل کی خبر نہ رہگذر کی
کیسی صورت ہے یہ سفر کی

باقی صدیقی کا ہر شعر اپنے اندر ایک صورت حال کا مکمل خاکہ لئے ہوتا ہے اور جب ہم زندگی میں اس جیسی حالت میں ہوتے ہیں تو شعر کے معانی اچانک روشنی بن کر دل کے آئینے میں قوس قزح کے رنگ بکھیرنے لگتے ہیں۔ اور شعر میں کہی گئی بات ہمیں اپنی بات محسوس ہونے لگتی ہے۔

اندر سے ٹوٹتے رہے ہیں
باہر سے زندگی بسر کی

اندر کچھ اور داستاں ہے
سرخی کچھ اور ہے خبر کی

لوگ منافقت کو بھی منفعت میں ڈھال لینے کا فن جانتے ہیں۔ نعرہ بازی اور ہنگامہ آرائی' انسانی جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ اور جب جذبات قابو میں نہ ہوں تو شدت جذبات میں غلط صحیح کی تمیز کئے بغیر ہر بات کو ہم سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ باقی صدیقی ایسی صورت حال کو سبق آموز تجربہ بنا دیتے ہیں۔ ایک ایک لفظ پکار پکار کر ہمیں خبردار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں کے الفاظ کے بجائے انکے عمل پر نظر رکھو۔ لوگ وہ کچھ نہیں ہوتے جو وہ کہتے ہیں۔ وہ دراصل وہ کچھ ہوتے ہیں جو وہ کر رہے ہوتے ہیں۔

ختم ہنگامہ ہوا جب تو کھڑا سوچتا ہوں
آپ ہی چور نہ ہوں شور مچانے والے

باقی صدیقی نے دراصل اپنی غزل کا خمیر زندگی کے ٹھوس حقائق سے اٹھایا ہے یہی وجہ ہے کہ انکے اشعار کے معانی کہیں بھی خلاف واقعہ معلوم نہیں ہوتے۔ ہر چیز اور ہر صورت حال ایسے لگتی ہے جیسے وہ پہلے سے موجود ہے صرف ہم نے اسے باقی صدیقی کے دکھانے پر دیکھا ہے۔ جذبات کی سطح پر تو محسوس کرتے رہے ہیں ذہنی سطح پہ اب سوچا ہے۔

ہم تو ہر دور کے مسافر ہیں
ظلم ہم پر ہوا تھا پہلے بھی
دل کے صحراؤں کو بسائے کوئی
شہر تو اک بسا تھا پہلے بھی
ہر سہارا پہاڑ کی صورت
اپنے سر پر گرا تھا پہلے بھی
آپ ہی آپ سامنے تھے ہم
ایک پردہ اٹھا تھا پہلے بھی

سیاسی سماجی معاشرتی اور اخلاقی حوالے سے جتنی باتیں بھی اکثر کہی جاتی ہیں کی نہیں جاتیں۔ اخلاق کتابوں میں بچے رہ جاتے ہیں اعمال میں نظر نہیں آتے۔ کاروبار حیات 'گا' 'گے' 'گی' کے خوش آئند وعدوں سے آگے نہیں بڑھتا۔ منزلوں کے خواب مسلسل دیکھے اور دکھائے جاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے وقت کے ساتھ چلتے رہنے میں عافیت مگر جاگ اٹھنے میں قیامت بپا ہونے کا

طرہ دھمکی آمیز نظروں سے ہر راہرو کو گھورتا اور منہ بسورتا رہتا ہے۔ اور ایسے ماحول میں جہاں
ھی آنکھیں موند کر بھیڑ بکریوں کی طرح اندھی تقلید میں لگے ہوں۔ آنکھیں کھول کر دیکھنا نہ
رف خطرناک ہوتا ہے بلکہ جان لیوا بھی۔ جھوٹے خوبصورت نعرے اور توقعات ہمیشہ سے آسیبی
ھلاوے کی طرح دلوں کو فریب دیتے رہے ہیں۔

یہی رنگ چمن کی باتیں تھیں
یہی شور صبا تھا پہلے بھی
پھول مہکے تھے رند بہکے تھے
جشن برپا ہوا تھا پہلے بھی
زیست کے ان فسانہ خوانوں سے
اک فسانہ سنا تھا پہلے بھی

باقی صدیقی نے شعر کو گفتگو کا لہجہ دے کر ایسی تہداری بخش دی ہے جو بیک وقت جمالیاتی
ر نفسیاتی درجے پر معانی کے ان گنت در کھولتی ہے۔ شعر میں تحقیق تنقید اور طنز کے لطیف
لو زندگی کے حقیقی چہرے کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔

جام کو جام جم سے دیں نسبت
اپنے خون کو مئے چکیدہ کہیں
غیر سے دوستی مبارک ہو
اور اب کیا وفا گزیدہ کہیں
اب وہ رنگ جہاں نہیں باقی
کس سے حال دل تپیدہ کہیں

باقی صدیقی بحیثیت شاعر بلا کے محتاط اور حساس ہیں۔ وہ اپنے شعر میں ایک لفظ بھی زائد
ستعمال نہیں کرتے۔ انہیں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ جو میں لکھ رہا ہوں وہ پڑھا بھی جائے
۔ اور جب پڑھا جائے گا تو وہ روانی سے پڑھا جا سکے۔ اس سوچ کا نتیجہ انکے کلام میں اس
ل میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ انکے اشعار میں 'گئے' 'بیہے' بہت کم نظر آتے ہیں۔ جنہیں
ھنے میں زبان کو دقت پیش آتی ہو۔ اسی طرح انکا وہ کلام جو انہوں نے اپنی ذاتی پختہ تنقید سے
زار کر اطمینان کر لیا ہے وہی اشاعت کے لئے بھی ضروری سمجھا ہے جو چھوڑا یا کاٹا جا سکتا تھا

انہوں نے اسے بے دریغ خود کاٹا ہے۔ اور جو باقی رکھا ہے پورے اعتماد کے ساتھ رہنے دیا ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے کلام سے اشعار چننے کے لئے ہم جب ہاتھ بڑھاتے ہیں تو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کیا چنا جائے۔ باقی صدیقی کا کلام خود ہی ایسا منتخب ہے کہ اسکا انتخاب کرتے وقت ڈر لگتا ہے کہ کہیں کچھ رہ نہ جائے۔ انکے کلام سے موقع محل کے مطابق اشعار علیحدہ تو کر سکتے ہیں۔ بھرتی کے اشعار سمجھ کر چھوڑے نہیں جا سکتے۔ یہ بات الگ ہے کہ قاری ان تلازموں تک پہلی خواندگی میں نہ پہنچ پائے جن کے سہارے غزل کے اشعار کی تفہیم ممکن ہوتی ہے۔ باقی صدیقی کی غزل سے ہر کوئی اس طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ جس طرح لذیذ کھانوں اور قدرتی پھلوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ آپ سیب کاٹ کر اس کی کوئی بھی کاش کسی سطح کے انسان کو کھلا دیں وہ وہی ذائقہ محسوس کرے گا۔ جو سب محسوس کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پیدائشی طور پر ہر شخص کی زبان میں فطری طور پر کچھ ذائقے رکھ دئے گئے ہیں۔

مگر باقی صدیقی کے اشعار سے لطف اٹھانے اور معانی تک پہنچنے کے لئے ایسے ذوق کی بھی ضرورت ہے جو پیدائشی طور پر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ اسے کثرت مطالعہ اور زندگی کے ہمہ گیر تجربات سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔

شفق کی آگ کہانی کوئی سنانے لگی
کسی کے خون کی بو راستوں سے آنے لگی
گلوں کے منہ میں زمانے نے آگ رکھ دی ہے
بہار اپنا ہی خوں پی کے لڑکھڑانے لگی

ادبی افق پر ترقی پسندی کا چھلاوا جس زور شور سے برصغیر میں ابھرا تھا اسی طرح جادو بھرے دل خوش کن نعروں کے ساتھ پسے ہوئے انسانوں کو محرومیوں کا احساس دلا کے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ مزدور کی ہڈی سونا اور چربی چاندی میں ڈھلتی رہ گئی۔

باقی صدیقی ترقی پسند تحریک سے پہلے اور بعد بھی عوامی اور عمومی سطح پر سوچ اور لکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس ہنگامی سیاسی و نیم ادبی تحریک سے باہر رہ کر بھی انسانی دکھ سکھ اور محرومیوں کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا ہے۔ آسمان کو اوپر سے دیکھنے والوں کے بجائے نیچے سے دیکھنے والے بے کسوں اور مجبوروں کی صف میں شامل رہ کر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ باقی صدیقی نے سونے کی سل پر بیٹھ کر سنی کی بات نہیں کی۔ زندگی کے گرم و سرد کو اپنے گالوں پر محسوس کر کے سوچا اور لکھا ہے۔

ہم ذرے ہیں خاک رہگزر کے
دیکھو ہمیں بام سے اتر کے
یہ بھی تو پہلو ہے اک حالات کا
لوگ جو کہتے ہیں وہ ہوتا نہیں
بات مظلوموں پہ آخر آئے گی
الٹے رخ دریا کبھی بہتا نہیں
دو چار گام ساتھ چلے ہیں پھر اہل غم
کچھ دور تک صدائے سلاسل گئی ہے پھر

باقی صدیقی کا مزاج شاعرانہ کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ بھی ہے۔ فلسفیانہ مزاج کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی ایسی صورت حال سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا جو موجود ہو۔ اور جو نہ ہو اسکی امید ہمہ وقت دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔

ٹوٹا ہے پھر غبار سر راہ کا طلسم
ہر راہرو کے سامنے منزل گئی ہے پھر
باقی وہ بادباں کھلے وہ کشتیاں چلیں
وہ ایک موج جانب ساحل گئی ہے پھر
فاصلہ بھی ہے نگاہوں کے لئے اک جادو
ہاتھ جو آ نہ سکے چیز حسیں ہوتی ہے
بیٹھے بیٹھے چمک اٹھتی ہیں نگاہیں باقی
دور کی شمع کہیں اتنی قریں ہوتی ہے

زندگی ایک پر اسرار حقیقت ہے۔ یہی خاصیت اسے جاذب نظر بناتی ہے۔ کچھ غلط فہمیاں زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہر شخص جب تک زندہ رہتا ہے اسکے گرد خوش فہمیوں کی گہری دھند کچھ اس طرح پھیلی رہتی ہے کہ اس سے آگے نہ تو کچھ نظر آتا ہے اور نہ وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ لوگ ہر چیز کو اپنے تخیل کی سنہری روشنی میں لپٹا ہوا دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی چہروں پر سے محسنات کی مصنوعی تہہ قربت یا غربت کی حدت سے اتر جاتی ہے۔ تو اچانک حقیقت کا انکشاف رگوں میں خون کو منجمد کر دیتا ہے۔ ماضی رائیگاں اور حال بے سود نظر آنے لگتا ہے۔

چشم نظارہ پہ کیا کوئی بھی الزام نہ تھا
چاندنی رات تھی اور کوئی لب بام نہ تھا
وہم تھا لوگ مرا راستہ تکتے ہوں گے
آکے دیکھا تو کسی لب پہ مرا نام نہ تھا

بے رنبتی دنیا و مافیہا سے ہمارا تعلق خاطر یکسر ختم کر دیتی ہے۔ ہر چیز سے جذباتی رابطہ اس طرح منقطع ہو جاتا ہے کہ آنکھیں سامنے کی اشیاء کو بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مگر ان آوازوں میں موجود پیغام کوئی جاذبیت نہیں رکھتا۔

اس طرح باغ سے چپ چاپ گذر آئے ہیں
جیسے پھولوں کی مہک میں کوئی پیغام نہ تھا

کاروبار حیات میں شمولیت کا نام زندگی ہے۔ اگر افراد میں اونچ نیچ اس قدر بڑھ جائے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنے سے علیحدہ مخلوق سمجھنے لگیں تو انسانی معاشرہ انحطاط کا شکار ہو کر تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہتی۔

لوگ مختلف طبقات میں بٹ جاتے ہیں اور بے حسی کی خلیج درمیان میں اس طرح حائل ہو جاتی ہے کہ ایک کا فائدہ دوسرے کے نقصان کے بغیر ممکن نہیں رہتا۔ مخاصمتیں جنم لیتی ہیں باہم نفرتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ معاشرے میں آدمی آدمی کے لئے اجنبی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں چیزوں کے معانی یکسر بدل جاتے ہیں۔

انصاف کتابوں میں بھلا لگتا ہے
مجرم ہے وہ مجرم جسے دنیا کہہ دے
تو دوش ہوا پر ہے تری بات ہے کیا
جو حادثہ ہو اس کو تماشہ کہہ دے

باقی صدیقی زندگی کو اپنے مزاج کے آئینے میں عکس در عکس دیکھتے ہیں۔ انہیں چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی ایک جہان معنی دکھائی دیتا ہے۔ مگر وہ کسی شے کو بھی اسکی ظاہری شکل و صورت کے معیار پر قبول نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر فرقت اور تنہائی کا احساس جہاں کہیں بھی ہو اپنی شدت کی وجہ سے براہ راست اظہار کا تقاضہ کرتا ہے اور شعرا اکثر فرقت اور تنہائی کے عذاب کو نام لے کر اپنے کلام بلاغت نظام کا موضوع بناتے ہیں۔ مگر باقی صدیقی اس اذیت کو بھی نام لئے بغیر کچھ اس طرح نظم کرتے ہیں کہ ابہام نام کی کوئی شے ابلاغ کی راہ میں حائل

نہیں ہونے پاتی۔ اور جمالیاتی سطح پر لطیف حسی کیفیت اظہار پا جاتی ہے۔

کر دیا ہے کام کیسا تو نے یہ میرے سپرد
رات بھر آوارہ قدموں کی صدا سنتا رہوں

پیدائش اور موت دونوں حادثے ہیں۔ حادثے اس لحاظ سے کہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن کا واقع ہونا کسی کے اپنے اختیار میں نہیں۔ باقی صدیقی اس شعر میں کرہ ارض پر موجود حیات کے نمائندہ کی حیثیت سے بے اختیاری اور بے بسی کا ذکر ایسے موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ کہ بے ثباتی میں ثبات کے خلاف احتجاج بھی ہے اکتاہٹ بھی۔

زندگی دو حادثوں کے درمیاں اک حادثہ
میں کہاں تک حادثوں کے درمیاں بہتا رہوں

زندگی مسلسل خواب دیکھتے رہنے کا عمل ہے۔ جاگتی آنکھوں سے دیکھتے خواب، مگر کبھی کبھی امیدوں کی دھند چھٹ جاتی ہے تو دنیا خوبصورت رنگ و رخسار کے بجائے روندے ہوئے پھولوں اور کچلے ہوئے گلزاروں کے منظر آنکھوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تمام شہر کی دیدہ زیب دیواروں کا پلستر اکھڑ گیا ہو اور چاروں طرف مکروہ شکل کالی بھجنگ دیواریں تاحد نگاہ پھیل گئی ہوں۔

ایسے عالم میں بدلا ہوا رنگ جہاں قلب و نظر پر جو اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ ہم اسکے لئے ذہنی طور پہ تیار نہیں ہوتے۔ تو ہراساں ہوتے ہیں وہ ذاتی حالات ہوں کہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی خستہ حالی۔

ہم دیکھ کر جہاں کو ہراساں ہیں اس طرح
یک لخت جیسے کوئی جگا کر چلا گیا

لیکن دنیا ایسے دیوانوں سے ابھی یکسر خالی نہیں ہو گئی۔ جو رسم و راہ زمانہ بھی نبھا رہے ہیں اور آنے والوں کے لئے آسانیاں اور آسائشیں فراہم کرنے کے لئے اپنے ذاتی دکھ درد کو خاطر میں نہیں لاتے ان ہی کے دم قدم سے نئی نئی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور آفاق اپنی تابانیوں کے ساتھ روشن چلے آتے ہیں۔

دیوانہ اپنے آپ سے تھا بے خبر تو کیا
کانٹوں میں ایک راہ بنا کر چلا گیا

اگر ہم چراغ جلتے دیکھتے ہیں تو انہیں کوئی جلانے والا بھی تھا۔ ہر جانب زندگی کی رونقیں اتنی تازہ اور نئی دکھائی دیتی ہیں جیسے ابھی ابھی یہاں کوئی آیا تھا جو ہر شے کو سنوار گیا۔ کوئی موج صبا کے ساتھ ادھر سے گزرا اور لق و دق صحرا میں ایسے سایہ دار درخت لگا گیا جن کے اثر سے زندگی دھڑکنے لگی ہے اور ویرانیاں ہریالیوں اور شادابیوں میں بدل گئیں ہیں۔

رات اپنے سائے سائے میں چھپتا رہا ہوں میں
اتنے چراغ کوئی جلا کر چلا گیا
اس طرح چونک اٹھا ہوں خیال میں
جیسے ابھی ابھی کوئی آ کر چلا گیا
باقی ابھی یہ کون تھا موج صبا کے ساتھ
صحرا میں اک درخت لگا کر چلا گیا

باقی صدیقی نظم کے راستے غزل کے ایوان میں داخل ہوئے تھے۔ نظم میں جو بات بہت سے اشعار کے مجموعی اثر سے کہی جاتی ہے۔ غزل میں صرف دو مصرعے وہ کچھ بیان کر دینے کی سکت رکھتے ہیں جس کے لئے نظم کے انداز میں ان گنت اشعار کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی صدیقی آہستہ آہستہ نظم سے دور ہوتے گئے اور غزل کو اسکی تاثیر اور ایجاز گوئی کی وجہ سے اپنی شاعرانہ طبعیت کے زیادہ قریب پایا تو اسی کے ہو کر رہ گئے۔ غزل نے باقی صدیقی کو آخر تک مایوس نہیں کیا۔ انہوں نے غزل کی تنگی و داماں کا گلہ کبھی نہیں کیا۔ کم سے کم الفاظ استعمال کئے اور غزل کو نئی معنویت سے آشنا کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے باقی صدیقی کی انگلیاں جہان اور اہل جہان کی نبض پر رہتی ہیں۔ اور وہ اپنی پوروں کے نیچے بہتے خون کی ہر لہر سے پورے عہد کے مزاج کا پتہ چلا لیتے ہیں سازو سامان کی بھر مار اور سکون و آرام کا فقدان جس محرومی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اسے وہ کسی ایک کا نہیں سب کا دکھ سمجھتے ہیں۔

باقی تمہیں حیات کا ساماں تو مل گیا
اک لمحے کی خوشی بھی کسی سے ادھار لو

باقی عصر جدید کے مزاج دان ہیں۔ یہی مزاج دانی انہیں حقیقت کے اتنے قریب لے آتی ہے کہ منظروں سے انکی نظر ہٹ کر پس منظروں کی گہرائیوں میں جھانکنے لگتی ہے۔ اور پھر چیزوں کے جو معانی کھلتے ہیں۔ ویسے نہیں ہوتے جیسے عام طور پہ سمجھ لئے جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں

احتیاط ضروری ہو جاتی ہے مگر کہاں تک؟۔

ہر رہرو اخلاص پہ رہتی ہے نظر اب
رہزن کی طرح کرتے ہیں ہم لوگ سفر اب

اسطرح اٹھا دل سے یقیں اہل جہاں کا
افواہ نظر آتی ہے سچی بھی خبر اب

دنیا کو ہے اب کانچ کے ٹکڑوں کی ضرورت
کس کے لئے دریا سے نکالو گے گہر اب

یہی وہ صورت حال ہے جس میں گھر کر فرد لوگوں کے ہجوم میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہ کہیں ایسے مقام پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔ جو نہ تو کسی کی گزرگاہ ہے نہ کسی کی منزل۔ کون آئے گا؟ صرف وہی جو ہجوم بے خبراں کی عام روش سے ہٹ کر چلے گا مگر زیادہ تر اشخاص عصر حاضر سے قدم ملا کر چلنے میں سکون پاتے ہیں۔
وہی کچھ سوچتے ہیں جو انہیں سوچنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ وہی کچھ کرتے ہیں جو انہیں کرنے کیلئے کہا جاتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو عقل و شعور سے کام لیتے ہیں مگر بھٹکے ہوئے گم گشتہ راہرو کہلاتے ہیں۔

منزل سے بہت دور نکل آیا ہوں باقی
بھٹکا ہوا راہرو ہی کوئی آئے ادھر اب

بس آنکھیں کھولنا ہی عذاب ہے۔ قرب و بعد' سچ اور جھوٹ' سفر و حضر' سبھی اپنے اپنے معانی سمجھانے لگتے ہیں۔ اور جب مقررہ پیمانے بھی جھوٹ بولنے لگیں تو لمحوں کی منزلیں صدیوں کی مسافتوں سے بھی طے نہیں ہوتیں راہرو اپنے آپ کو روبوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ کسی آہنی قوت کے ایماء پر کر رہے ہیں۔ کوئی استحصالی طاقت ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سب کو ہانک رہی ہے۔

ہم تری بزم سے بازار میں جب لائے گئے
دور تک ساتھ لپٹتے ہوئے کچھ سائے گئے

ہائے یہ شوق کہ ہر لب پہ تھا پیغامِ سفر
وائے یہ وہم کہ ہر گام پہ ٹھہرائے گئے

روز ہم اک نئے احساس کی تصویر بنے
روز ہم اک نئی دیوار میں چنوائے گئے

باقی صدیقی کو ہر طرف تخریب کے آثار نظر آتے ہیں۔ تو وہ بے اختیار پوچھنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہر طرح کی خرابی تمام شعبہ ہائے حیات کو اپنی لپٹ میں لیتی چلی جاتی ہے اسکا کہیں اختتام بھی ہے کہ نہیں؟۔ جو خرابی شروع ہوتی ہے وہ سلسلہ در سلسلہ پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ امیدوں اور توقعات کی صورت میں جو موجِ بہار آئی تھی وہ بھی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔!

موجِ بہار کے بھی قدم لڑکھڑا گئے
جاتا ہے کتنی دور خرابوں کا سلسلہ

مگر وہ مایوس نہیں ہوتے انہوں نے ہر لحظہ بدلتے ہوئے حالات میں بھی ثابت قدم رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور طریقہ کار یہ اپنایا ہے کہ وقت کی SandWatch کے ساتھ ساتھ اپنا سفر بہر حال جاری رکھیں آج نہیں تو کل ضرور کوئی ایسا مقام آ جائے گا جہاں حالات میں ٹھہراؤ اور معاملات میں استحکام پیدا ہوگا۔ ہر سطح پہ آئینی چھلاوے' حقیقت کو جھوٹ کے گہن سے آزاد کردیں گے۔

پیچھے نہ موجِ ریگِ رواں کے چلے چلیں
ہوگا کہیں تو ختم سرابوں کا سلسلہ

ایسا معلوم ہوتا ہے پوری کائنات کو پر اسراریت نے گھیر رکھا ہے۔ کسی عمل سے حتمی ردِ عمل کا اندازہ پہلے سے کر لینا ممکن نہیں۔ بیج سے کوئی پودا برآمد ہو گا۔ اسکی ٹہنیوں پہ پھول پات آئیں گے یا اسکی ننگی ٹہنیاں دھوپ کی شدت میں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ آج جو بچہ پیدا ہوا ہے کل کو والدین' معاشرے اور وطن کے لئے کامیابیوں کا ذریعہ بنے گا یا تباہی کا۔ اعمال پہ تو کسی حد تک اختیار ہو سکتا ہے نتائج پہ نہیں۔

گل کے پردے میں ہے کیا معلوم نہیں
شعلہ صرصر ہے کہ صبا معلوم نہیں

لحظہ لحظہ دوری بڑھتی جاتی ہے
کل کا انساں کیا ہوگا معلوم نہیں

ہر چہرے کے پیچھے کتنے چہرے ہیں
کون ہمیں کس وقت ملا معلوم نہیں

خود داری اور پاس وضع کا خیال باقی صدیقی کو جھکنے نہیں دیتا۔ وہ عزت نفس کو بہر حال عزیز رکھتے ہیں۔ مانگے کا اگر ہو تو آب حیات کا گھونٹ بھی انہیں زہر لگتا ہے۔

بخشے ہوئے اک گھونٹ پہ ہم جھوم رہے ہیں
اب مانگ کے پینا بھی کوئی ننگ نہیں کیا

ہر بات پہ ہم دیتے ہیں غیروں کا حوالہ
اپنا کوئی آہنگ کوئی رنگ نہیں کیا

زخم دل بے تاب ہے ہاتھوں میں نوالہ
اس بات پہ دنیا سے میری جنگ نہیں کیا

تقسیم کار، تقسیم زر اور حفظ مراتب کی انسانی معاشرے میں اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کوئی گھر ہو یا ادارہ، شہر ہو کہ ملک تباہی اسی راستے سے آتی ہے۔

الٹی بساط میکدہ جام ہوس چلے
ساقی کا خون پی لیں جو رندوں کا بس چلے

اے خالق بہار یہ کیسی بہار ہے
ہم اک تبسم گل تر کو ترس چلے

باقی وہی تپش ہے وہی رنگ و بو کی پیاس
کہنے کو جھوم جھوم کے بادل برس چلے

باقی صدیقی کو اپنی انفرادیت کا پوری طرح ادراک ہے۔ وہ آوازوں کے ہجوم میں اپنی آواز

کو گم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے لہجے اور اسلوب میں ایسی پختگی اور رچاؤ پیدا کر لیا ہے جو ہزاروں میں بھی صاف پہچانا جا سکتا ہے۔

اک اپنی وفا کی روشنی سے
کس کس کا دیا جلائیں گے ہم

ہر رنگ جہاں سے ہٹ کے دیکھو
اس طرح نظر نہ آئیں گے ہم

شدت احساس کے ان گنت نادر نمونے باقی صدیقی کے کلام میں ایسے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

لے گیا ساتھ اڑا کر باقی
ایک سوکھا ہوا پتہ ہم کو

زیست چلی ہے کس جانب
لے کر کاسہ سر سر کا
کیا کیا رنگ بدلتا ہے
وحشی میرے اندر کا

سر پہ ڈالی سرسوں کی
پاؤں میں کانٹا کیکر کا

اب تو وہ جی سکتا ہے
جس کا دل ہو پتھر کا

تم زمانے کی راہ سے آئے
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا

یوں بھی ہونے کا پتہ دیتے ہیں
اپنی زنجیر ہلا دیتے ہیں

دوستی خون جگر چاہتی ہے
کام مشکل ہے تو رستہ دیکھو

پھر بھی شمع جلا دی ہم نے
جانے کیا وقت سحر یاد آیا

زندگی گزرے گی کیونکر باقی
عمر بھر کوئی اگر یاد آیا

آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میر کارواں ٹھہرے

کشتیاں لوٹ گئی ہیں ساری
اب لئے پھرتا ہے دریا ہم کو

پرواز کا وقت آ گیا تو
ہم دیکھ سکے نہ بال و پر کو

باقی صدیقی اول اور آخر پاکستانی تھے۔ انکے خیال میں زندگی ہوا میں معلق رہ کر نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ اور اگر زندگی کے بارے میں کوئی خطہ نظر بھی ہو تو اسکے پیدا کرنے کیلئے کسی قطعہ زمین کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ سانس لینے کے لئے ہوا کی۔

ان کا اپنے وطن عزیز کے ساتھ صرف ذہنی حد تک ہی تعلق نہیں تھا وہ شدید جذباتی تعلق خاطر بھی رکھتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے امکانات ابھی پیدا ہوئے تھے تو وہ تڑپنے لگے تھے اور لندن میں بی بی سی پر شیخ مجیب الرحمن کا بیان سن کر اللہ کو جان دے دی۔ باقی صدیقی پاکستان کے بغیر زندگی کو بے مقصد جانتے تھے۔ انکے اس جذباتی لگاؤ کے آثار انکی غزل میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ انکی شاعری میں تنقیدی رویہ اسی مرکز سے پھوٹتا ہے۔ وہ طنز بھی کرتے ہیں تو اسی پہلو سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انکا رونگٹا رونگٹا وطن کی مٹی کے ذرے ذرے سے پیوستہ

طرح ہم آہنگ اور مربوط ہے۔

لوگ اپنے دیئے جلانے لگے
داغ دل ہم کو یاد آنے لگے

یہی رستہ ہے اب یہی منزل
اب یہیں دل کسی بہانے لگے

کچھ نہ پاکر بھی مطمئن ہیں ہم
عشق میں ہاتھ کیا خزانے لگے

ہم تک آئے نہ آئے موسم گل
کچھ پرندے تو چہچہانے لگے

اس غزل کو ملک کی مشہور و معروف گلوکارہ اقبال بانو نے بڑی خوبصورتی سے گایا ہے۔ بازار میں بکنے والے کیسٹس میں یہ غزل بھی شامل ہے اسکے اشعار میں ایسی جاذبیت اور مٹھاس ہے کہ ہر شخص کو متاثر کرتی ہے۔ اسی غزل میں ایک ایسا شعر بھی موجود ہے جس میں کہی گئی بات من و عن پوری ہوگئی۔ باقی صدیقی نے جب یہ شعر کہا تو انہیں یہ احساس تک نہ ہوا ہوگا کہ میں اپنے بارے میں پیش گوئی کر رہا ہوں۔

ایک پل میں وہاں سے ہم اٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

8 جنوری 1972ء اس شعر کی عملی تکمیل کا دن تھا۔ یعنی باقی صدیقی کی اچانک وفات کا دن!!

زاد سفر

یہ کتاب باقی صدیقی کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں انکا غیر مطبوعہ حمدیہ اور نعتیہ کلام ہے۔ کتاب پنڈی ادبی سوسائٹی راولپنڈی نے چھاپی ہے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ سال اشاعت 1984ء درج ہے۔ پہلی بار پانچ سو کی تعداد میں چھاپی گئی تھی کتابت افتخار احمد نے کی۔ ناشر رشید نثار ہیں پرنٹرز ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی سرورق پی یو ایڈورٹائزنگ راولپنڈی کا ہے۔

انتساب قادر مطلق کے نام ہے۔ پیش لفظ جناب ایوب محسن نے لکھا۔ "زاد سفر کا حسن" کے عنوان سے ایک مختصر تعارف جسے جناب احمد ندیم قاسمی نے 14 اگست 1976ء کو لاہور میں تحریر فرمایا بھی شامل ہے۔ گرد پوش پر باقی صدیقی کے کلام کے بارے میں کچھ مشاہیر کی آراء بھی درج ہیں۔

نعت ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں عقیدت و مودت کے اظہار کی غرض سے کہی گئی کوئی بات بھی مبالغہ نہیں کہلا سکتی۔ اللہ جل شانہ کے بعد ختمی مرتبت احمد مجتبیٰ محمد مصطفے ﷺ ہی کی ذات والا صفات لائق توصیف و تعریف ٹھہرتی ہے۔" بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔ مگر پھر بھی کمال احتیاط کی ضرورت ہے۔ باخدا دیوانہ باش وبا محمد ﷺ ہوشیار۔

حمد باری تعالیٰ ہو کہ نعت رسول مقبول ﷺ دونوں مقامات ایسے ہیں جہاں انتہائی احتیاط لازم ہے۔ اظہار عقیدت کا ہو یا محبت کا مناسب الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ الفاظ کسی زبان کے بھی ہوں۔ انکی پہلی سطح اندرونی معانی سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ان محاکاتی ماورا سے جو ذہن انسانی کے کینوس پر موزوں الفاظ کے زور پر ابھرتی ہیں۔ اگر وہ ممدوح کی صفات کو اجاگر کرنے کے بجائے مفہوم کو غیر واضح اور مبہم ہیولائی کیفیات میں الجھا دیں تو عقیدت کا اظہار تو ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے ہوش و حواس کی محسوس اور معلوم فضا کے پورے ادراک کے ساتھ حضور سرور کائنات ﷺ سے محبت و مودت کی وادی ء بے کراں میں قدم رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں گفتگو کے مقابلے میں خاموشی احترام و عقیدت کے اظہار کے لیے زیادہ موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد ﷺ است

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا یہ نعتیہ شعر اپنے علمی اور ادبی معیار کے ساتھ عقیدت مندی کا

بھی ایسا اظہار ہے جسکی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ اس شعر میں اتنا عجز اور اس درجے کی انکساری موجود ہے کہ اس سے بڑا عجز ممکن ہی نہیں۔ اور فروتنی تو اس سے بھی آگے کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ یہ مقام ہی ایسا ہے جہاں تعریف و توصیف نازک سے نازک اور ادق سے ادق الفاظ کی بڑی سے بڑی کھیپ بھی اگر میسر آجائے تو بھی اظہار و بیاں کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ نتیجتاً ہر کوشش کے بعد ایک لطیف سی کسک بے بضاعتی کا احساس بن کر دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگتی ہے۔

بہر حال نعت گوئی ایک اعزاز ہے جسکی تمنا ہر شاعر کے دل میں ہمہ وقت چٹکیاں لیتی رہی ہے۔ نعت گو شعراء کی فہرست اتنی طویل ہے کہ سارے نام گنوائے نہیں جاسکتے۔ بہر حال ان اسمائے گرامی میں ایک اولین نام کعب بن زہیرؓ کا ہے جنہیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ انکا لکھا ہوا قصیدہ آنحضورﷺ کے سامنے پڑھا گیا اور آپﷺ نے پسند بھی فرمایا۔

اب جدید حمد و نعت نے متغزلانہ پیرایہ اظہار کو اپنا لیا ہے۔ باقی صدیقی نے بھی اسی پیرائے میں حمد و نعت گوئی کی ہے۔ اور یہی انکی شاعرانہ طبیعت کے عین مطابق بھی تھا وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں اور اس اسلوب میں نعت کہنا انکے لئے ایسا ہی ہے جیسے غلامان محمدﷺ میں سے کوئی دور دور مجبور پھرنے اور مختلف ہواؤں فضاؤں اور زمینی موسموں میں زندگی کرتے کرتے ایک دن اچانک روضہ رسول مقبولﷺ پر جا پہنچے اور مدینے کی ہوا میں سانس لینے لگے۔

باقی صدیقی کی غزلوں کے بعد جب انکی نعتیں پڑھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ پھیپھڑوں میں زمینی ہوا کے بجائے گلشن مدینہ کی ایسی معطر و جانفزا صبا بھر گئی ہے جو ابھی ابھی گنبد خضرا سے چھو کر آئی ہے اور اسکے جھونکے ہر طرف فضا میں تحلیل ہوگئے ہیں۔

باقی صدیقی حمد و نعت میں نقالی نہیں کرتے۔ وہی غزل کی سی سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر کلام چھوٹی بحروں میں لکھا ہے۔ وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہ تو کوئی بات کہتے ہیں اور نہ زیادہ شاعرانہ شوخی ظاہر کرتے ہیں۔ انکی حمد و نعت سے ایسا تاثر ملتا ہے گویا باقی صدیقی ممدوح کے سامنے دست بستہ حاضر ہیں۔ انکساری اور فروتنی انکی حمد و نعت کی پہچان ہے۔

خانہ کعبہ کو دیکھ کر پہلا خیال یہ آتا ہے کہ اسکی عمارت میں گل بوٹے اور پھول پتی اور دوسری سجاوٹیں جو عام طور پر عمارات کو دیدہ زیب بناتی ہیں۔ یہاں کیوں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ کیا مسلمانوں میں ایسے فنکار نہیں گزرے جو اپنی عقیدتوں اور محبتوں کا اظہار کرنے کیلئے کعبہ کی

عمارت کو اپنے فن کے شہ پاروں سے خوبصورت اور جاذب نظر بناتے۔؟ اس کے ساتھ ہی یہ خیال جواب کے طور پر دل میں ابھرتا ہے کہ مسلمانوں میں فنکار بھی ہیں دستکار بھی مصور بھی ہیں اور نقاش بھی مگر اللہ کے گھر کے سامنے سب نے علوم و فنون کو Surrender کر کے عملاً" اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ خانہ کعبہ کی سادگی اور وقار میں کسی قسم کی مصنوعی پھول پتی سے کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہی حال باقی صدیقی کی حمد و نعت کا بھی ہے۔ جو ہر طرح کے غلو اور سعی سے پوری طرح پاک ہیں۔

خود رحمی جو قصیدہ' نظم یا غزل میں پسندیدہ نہیں خیال کی جاتی حمد و نعت میں قابل ستائش بن جاتی ہے۔

الٰہی تو میرا خالق ہے' تو میرا معبود
نہیں ہے تیرے سوا اور کوئی قصد تمام

وہ خوش نصیب گھڑی مجھ کو بھی عطا کر دے
طواف کعبہ کروں پاؤں میں ترا انعام

"زاد سفر" کے شروع میں حمدیہ کلام ہے۔ جس میں خالق کائنات کی خلاقیت و برکات و بزرگی کو عقیدت مندی عاجزی اور انکساری سے پورے شاعرانہ احترام سے بیان کیا ہے۔

نقش ہے ایک تیری قدرت کا
اور یہ رنگ گلستان کیا ہے
تیرے لطف و کرم سے قائم ہے
ورنہ یہ ربط جسم و جان کیا ہے

باقی صدیقی چھوٹی بحروں کے غواص ہیں' حالانکہ مضامین آفرینی کے لیے اتنی گنجائش کی ضرورت ہوتی ہے کہ دو چار الفاظ سلیقے اور قرینے سے شعر میں کوئی تاثر پیدا کر سکیں۔ مگر یہاں بھی باقی اپنی غزل کی طرح کم سے کم الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ اسکے باوصف انکی زبان میں لکنت نہیں آتی اور مفہوم پورے طور پر شعری جاذبیت کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے۔

تیری قدرت کے نشاں
یہ زمیں یہ آسماں

عقل ہے حیرت زدہ
دیکھ کر کون و مکاں

تیری زیبائی کے رنگ
گلستاں در گلستاں

ایک سے ایک بڑھ کے ہے جلوہ
چاند ہے' پھول ہے' ستارے ہیں

باقی صدیقی جب خالق کی تخلیقات کا ذکر کرتے ہیں تو یہ انکا انداز اظہار تشکر ہے۔

کوئی نعمت ملی کیا ہے شکر
کوئی مشکل پڑی دعا کی ہے

اس طرح بھی کیا ہے یاد تجھے
اس طرح بھی تری ثنا کی ہے

حمد بھی تیرے فضل سے لکھی
نعت بھی تو نے ہی عطا کی ہے

جب آنکھ کسی گماں نے کھولی
تو نے دل کو وہیں خبر کی

انسانی زندگی چاروں طرف سے ایک ایسی غیر واضح فضا نے گھیر رکھی ہے کہ تشکیک اور وہم و گمان سے کلی طور پر نجات نہیں۔ مگر اللہ کا فضل ہے جس نے ضمیر نام کا ایک پرزہ پہلے سے دل کے نہاں خانے میں کچھ اس طرح فٹ کر دیا ہے کہ جونہی کوئی گمان بیدار ہونے لگتا ہے ضمیر خطرے کی گھنٹی بجا کر خبردار کر دیتا ہے۔

باقی صدیقی کا ایمان کامل ہے وہ اپنے آپ کو کبھی غیر محفوظ محسوس نہیں کرتے انکی زندگی

میں حوادث آتے ہیں ٹل جاتے ہیں' غم کے سائے چھاتے ہیں ڈھل جاتے ہیں۔
باقی صدیقی اس امر کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ہم آپ ہی دشمن جاں ہیں۔ کبھی ہماری اپنی آگ اور کبھی دنیا کے شعلے ہمیں جلاتے ہیں مگر مولا کے کرم کی وجہ سے محفوظ و مامون رہتے ہیں۔

رگ جاں بن گئے تھے غم کے سائے
کرم تیرا ہوا ہے تو ڈھلے ہیں

کبھی دنیا کے شعلوں نے جلایا
کبھی ہم آگ میں اپنی جلے ہیں

باقی صدیقی سیدھے اور سادہ الفاظ میں کہی ہوئی بات کو کہیں نہ کہیں ایسا مل دے جاتے ہیں کہ طبیعت سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اگر باقی یہ نکتہ نہ بھاتے تو بات عقل کی گرفت میں کبھی آ ہی نہیں سکتی تھی۔

سلام اس پہ دیا جس نے ہم کو حق کا پیام
خدا کے بعد ضروری ہے لینا جس کا نام

نکتے کی بات یہ ہے کہ صرف خدا کا نام لے لینا کافی نہیں جب تک ہادیء برحق خاتم النبین رحمتہ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے نام نامی کا ذکر نہ کیا جائے۔ "خدا کے بعد ضروری ہے لینا جس کا نام" کہہ کر ذکر نبی ﷺ کو ناگزیر قرار دیا ہے۔

وہ نام جس پہ فرشتے بھی بھیجتے ہیں درود
ہماری فہم کی حد سے بلند جس کا مقام
وہ جس کے واسطے گردش میں آئے صبح و شام
وہی ہے ایک وسیلہ ہماری بخشش کا
ہزار اس پہ درود اور ہزار اس پہ سلام

سودت عقیدت اور بے پایاں محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ باقی صدیقی نے شعریت پر بھی پوری طرح نگاہ مرکوز رکھی ہے کہ شدت جذبات میں کوئی پہلو کسی طرح سے تشنہ نہ رہ جائے۔
ختمی مرتبت حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے بے نشان کا نشاں مل گیا۔ مہر و ماہ کو ضیا ملی'

آسمان کو آسماں کا مرتبہ حاصل ہوا۔ آپ ﷺ ہی نے تفسیر دو جہاں کی ہے ورنہ آفرینش و بقا کا کوئی راز کب عقل انسانی پر عیاں ہو سکتا تھا۔ آپ اگر تشریف نہ لاتے تو نہ جانے ہم کس طرف رواں ہوتے۔

بے نشاں ہی تھے بے نشاں ہوتے
تم نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے
مہرومہ کو نہ یہ ضیاء ملتی
آسماں بھی نہ آسماں ہوتے
تم نے تفسیر دو جہاں کی ہے
ورنہ یہ راز کب عیاں ہوتے
تم دکھاتے اگر نہ راہ حیات
جانے کس سمت ہم رواں ہوتے
ہمیں اپنی جبیں نہ مل سکتی
اتنے غیروں کے آستاں ہوتے
تم نے بخشی ہے روشنی ورنہ
دیدہ و دل دھواں دھواں ہوتے

باقی صدیقی توحید پر ایمان راسخ رکھتے تھے اور فرقہ بندی تک کو شرک گردانتے کڑھتے رہتے تھے کہ جب قرآن میں واضح طور پر لکھا ہے " کان الناس امۃ واحدۃ" اگر پوری نسل انسانی ایک امت ہے تو مسلمانوں نے اپنے آپ کو کس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ہر جگہ باہم آویزش اور ہنگامہ آرائی کے مکروہ مناظر ہیں ایک کا ہاتھ دوسرے کے گریبان کو چاک کرنے سے گریز نہیں کرتا۔

انسانیت اسی عذاب میں گرفتار تھی جب پیغمبر اسلام کی بعثت ہوئی آپ تشریف لائے تو:۔

پتھر دلوں کو موم بنایا ہے آپ نے
اللہ کا کلام سنایا ہے آپ نے
انسانیت کا نام کوئی جانتا نہ تھا
انسانیت کا نام بتایا ہے آپ نے
دنیا میں بے کسوں کو نئی زندگی ملی

سینوں سے بے کسوں کو لگایا ہے آپ نے

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کوئی شاعر اچھا نظم گو ہے تو وہ غزل بالکل ہی نہیں کہہ سکتا۔ اردو زبان کا اچھا شاعر ہے تو پنجابی' پوٹھوہاری میں اس بلندی پر نظر نہیں آتا جو اسکی پہچان ہوتی ہے۔ مگر باقی صدیقی کے ہاں یہ فنی کمی بیشی کہیں نظر نہیں آتی وہ ہر لباس میں باقی صدیقی ہی رہتے ہیں۔ نعت ہو کہ غزل انکے دلکشی میں فرق آتا ہے نہ تاثر میں۔

غزل کے اسلوب میں نعت لکھنا آسان نہیں مشکل کام ہے۔ مشکل اس لئے کہ نعت اور غزل میں جو فرق ہے اسے قائم رکھنا اور نبھانا بڑی فنکارانہ مہارت کا تقاضہ کرتا ہے یہی تو وہ مقام نازک ہے جہاں بڑے بڑے کہنہ مشق شعراء بھٹک جاتے ہیں۔ بہک جاتے ہیں اور ہوش میں نہیں رہتے۔ نعت گوئی دراصل تیز دھار تلوار پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے ذرا سی افراط و تفریط سے عمر بھر کے اعمال ضائع ہونے کا احتمال ہر لمحہ موجود رہتا ہے۔ اکثر نعتیں غزل کے عاشقانہ مزاج اور والہانہ بے تکلفی کی فضا میں حفظ مراتب اور ادب و احترام کی حدود و قیود کے اندر نہیں رہتیں۔ مگر باقی صدیقی نے عجب احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہیں ہر لمحہ اس بات کا احساس رہتا ہے کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ اور کیوں لکھ رہے ہیں۔ چھوٹی بحر میں لکھنے کی مشق اس معاملے میں باقی صدیقی کے بہت کام آتی ہے غیر ضروری لفاظی کے بجائے وہ چند ضروری الفاظ کو نظم کرتے ہیں اور انہی میں بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کر جاتے ہیں۔ انکے نزدیک غزل اور نعت صرف دو مختلف الفاظ ہی نہیں انکے معنی اور مزاج میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ باقی صدیقی وہ شاعر ہیں جنہوں نے اس فرق کو پوری طرح سمجھا اور قائم رکھا ہے۔ ورنہ شعراء شعر گوئی میں حضور [illegible] کو تو تم تمہارا کے الفاظ سے خطاب کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

ہے لقب کتنا حسین
رحمت للعالمین
آپ ی صورت کہیں
دہر نے دیکھی نہیں
کام ہر اک معجزہ
بات ہر اک دلنشیں
نقش پا سے آپ کے

بن گئی جنت زمیں
کافروں نے بھی کہا
آپ کو صادق امین
ہے مدینے کی ہوا
روح پرور عنبریں
آخرت میں آپ ہی
ہیں شفیع المذنبیں

باقی صدیقی کی نعت رحمت و بخشش کا پر زور مطالبہ نہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا حق سمجھ کر مانگنے کی جسارت نہیں وہ آقا کی عطا کے امیدوار و طلبگار ہیں۔ یہ انکساری اور فروتنی آنکھیں زمین میں گاڑھ کر اپنے آپ کو مجرمانہ پیش کرنے کی ادا ہے۔ جو باقی صدیقی کے حمدیہ اور نعتیہ کلام میں منفرد رویے کے طور پر اپنی پہچان کراتی ہے۔

اپنی رحمت کی نظر سے بھر دے
کاسہ دل ہے مرا بھی خالی
تیری رحمت کی ہوا جب آئی
جھوم جھوم اٹھی ہے ڈالی ڈالی
اب نہیں اور تمنا کوئی
ہے یہ دنیا میری دیکھی بھالی
تو دکھائے گا تو میں دیکھوں گا
روضہ پاک کی رنگیں جالی

باقی صدیقی کے سارے کلام میں ایک عجیب سی کسک کا احساس ملتا ہے۔ انکی نعت کا ہر مصرعہ ایک ایسے عقیدت مند کا حلیہ پیش کرتا ہے جو ایک مدت سے بخشش و رحمت کی راہ میں پڑا ہے۔ ہر لمحہ اڑ کر دربار رسالت میں پہنچنے کا شوق انکے دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ مگر وسائل اور حالات زندگی اجازت نہیں دیتے۔ جب وہ اوروں کو اللہ کے گھر اور روضہ رسول کی زیارت کے لئے جاتے جوق در جوق دیکھتا ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ اور جب دوسرے اسے پہنچتے ہوئے لگتے ہیں تو وہ اپنے دل میں ناکامی کی ایک ٹیس محسوس کرتا ہے کہ سب پہنچے جاتے ہیں صرف میں ہوں کہ رہا جاتا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر لوٹ کر آنے والے سے دیار حبیب

ﷺ کی باتیں پوچھتا پھرتا ہے اور تصور کی آنکھ سے وہ کچھ اپنی روح میں جذب کر لینا چاہتا ہے جو اسے دیکھتی آنکھوں سے دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

مجھے بتا کہ وہ شہر جہاں کیسا ہے
مسافروں کا کیفوں کا حال کیسا ہے
وہاں سحر کی ہوا کس ادا سے چلتی ہے
نگاہ ہوتی ہے حیران یا مچلتی ہے
وہاں کی رات تو تصویر صد سحر ہوگی
وہاں کے ذرے ہیں تارے تجھے خبر ہوگی
عجب وہاں کا نظارا ہے لوگ کہتے ہیں
وہ خوش نصیب ہیں جو اس فضا میں رہتے ہیں

جہاں ہے روضہ اقدس وہ کیا گلی ہوگی
کسی چمن میں نہ ایسی کوئی کلی ہوگی
وہی حضور ﷺ کا روضہ وہی مکان بھی ہے
وہ اک زمین بھی ہے ایک آسمان بھی ہے
وہاں سنا ہے عجب خوشبوؤں کے ریلے ہیں
اسی گلی میں حسنؓ اور حسینؓ کھیلے ہیں
بہار مسجد نبوی تو بس عجب ہوگی
دوبارہ دیکھوں یہ دل میں تیرے طلب ہوگی

بتا کہ گنبد خضرا کی شان کیسی ہے
بلندیوں کی وہاں آن بان کیسی ہے
مچل رہی تھی ترے دل میں آرزو کیسے
گیا تھا روضہ ء اقدس کے پاس تو کیسے
حرم کے بعد وہی تو ہے اک مقام حیات
کہ جس کی دید سے ہوتی ہے آدمی کو نجات

باقی صدیقی مشہور و مقبول تو اردو غزل کے حوالے سے ہیں۔ مگر انکے کلام سے اب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ شروع سے حمد و نعت اور مناجات بھی باقاعدگی سے لکھتے چلے آئے ہیں۔ شاید وہ اس صنف کو صرف اور صرف عقیدت کا اظہار سمجھ کر لکھتے رہے بخشش اور رحمت کا ذریعہ خیال کرتے رہے۔ اپنی شہرت اور تعارف کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ان میں باقی صدیقی کا انداز گفتگو بھی کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ اپنے خالق سے ہم کلام ہیں یا اپنے آپ سے۔ باقی صدیقی انتہائی کم آمیز انسان تھے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے آپ تک ہی محدود رکھنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ اور ایسا مخلص مزاجا" کھل کر سامنے نہیں آتا اسے کھولنا پڑتا ہے۔ بہر حال باقی صدیقی حمدیہ و نعتیہ کلام کو عمر بھر کا سرمایہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں۔

یہ حمد یہ نعت یہ مناجات
میری ہے کمائی عمر بھر کی

ایک دعائیہ انداز ہے جو انکے بیشتر کلام میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے علاوہ نہیں نہیں دنیا کے نا مساعد حالات ہیں جو سالک کیلئے سدراہ بنتے ہیں۔ زندگی کو باقی صدیقی استحقاق نہیں جانتے خالق حقیقی کی عطا مانتے ہیں۔

دل بیتاب کر اس کی ثنا اور
خوشا قسمت کہ اک دن مل گیا اور
یہی ہے راستہ دل کے سکوں کا
کہ ہو اک التجا اور اک دعا اور
ملے دو گز زمیں یثرب میں باقی
نہیں اسکے سوا اب مدعا اور

حمدیہ اور نعتیہ کلام میں باقی وہی اردو غزل والے باقی رہتے ہیں۔ وہی کفایت لفظی، وہی سادگی، وہی پختہ کلامی، خیال کی گہرائی اور چھوٹی بحر کا زنانے دار چٹکارہ جو باقی صدیقی کے ساتھ غزل میں آیا تھا۔ اور انہیں کے ساتھ ختم ہوگیا۔

دیکھ کر پھول شرارے دیکھے
تیری قدرت کے نظارے دیکھے
تیری رحمت کی گھڑی جب آئی

سامنے اپنے کنارے دیکھے
تیرا اک ایک کرم یاد آیا
جب بہتے ہوئے دھارے دیکھے
اس نے اللہ کو دیکھا باقی
جس نے اللہ کے پیارے دیکھے

کچے گھڑے

کچے گھڑے باقی صدیقی کی پنجابی پوٹھوہاری نظموں کا مجموعہ ہے۔ اسے مجلس شاہ حسین، دو موریہ پل لاہور نے شائع کیا ناشر کا نام ریاض راہی ہے۔ یہ پہلی بار مارچ 1967ء میں برقی آرٹ پریس لاہور سے چھپی، اور دوسری مرتبہ اکتوبر 1982ء میں کتاب کی قیمت پندرہ روپے مقرر تھی۔

رائے منصب علی خان نے "اک دو گلاں" کے زیرِ عنوان اس کتاب کا تعارف لکھا۔ جبکہ دیباچہ منیر احمد شیخ نے "بھیریں حس دی شاعری" کے عنوان سے تحریر کیا۔ رائے منصب علی خان کا لکھا ہوا تعارف اور منیر احمد شیخ کا دیباچہ دونوں کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب کل 91 صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے پندرھویں صفحہ پر تین مصرعوں کی ایک مختصر نظم بغیر عنوان کے درج ہے۔

وقت سمندر چھلاں مارنے
کنڈھے اتے کھلی دیاتی
کچے گھڑے الارے

اس سے اگلے صفحہ پر ایک شعر ہے۔

رنگ برنگے چمن تے دن سونے سنگ
باقی جلیاں پھیر کے کچے گھڑے تے رنگ

کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر باب کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے۔ "باری وچ بیٹھا تکاں" یہ ایک نظم کا عنوان بھی ہے جس کے تحت کئی اور نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ دوسرا باب "اوہیں ہینڈا صاف کھلا" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ تیسرا باب ہے "دل عمراں ناں پینڈا ناپے" اور چوتھا باب "بھری جوانی شکر دوپہراں" سے معنون ہے۔ پانچواں باب "کھیڈن دے دن چار" اور کتاب کے چھٹے اور آخری باب کا عنوان ہے۔ "دکھنا پیا سواں ڈھولا"۔

باقی صدیقی اردو غزل کے حوالے سے کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن یا وصف بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے علاوہ پنجابی پوٹھوہاری زبان میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ جو پنجابی ادب میں اپنا منفرد اسلوب لے کر آتی ہیں۔ اور اپنی ساخت میں خاصے کی چیز ہیں۔ ان

نظموں میں معانی کی ویسی ہی لطیف پرتیں ہیں جیسی انکی اردو غزل کے مفہوم و مطالب میں موجود ہیں۔ انکے کلام میں علامتی اظہار کا ایک مخصوص انداز اور مطالب کا آفاقی رویہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ انہیں اپنے گردو پیش کی دنیا میں روزمرہ کی چیزوں میں بھی ایسے معانی دکھائی دیتے ہیں جو عام انسانوں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ مگر جب باقی صدیقی اپنی تخلیق مابعد الطبیعات کا در کھولتے ہیں تو قاری کو وہی کچھ سوجھتا ہے جو اسے باقی صدیقی اپنے فن کے عدسے سے دکھانا چاہتے ہیں۔ میں یہاں باقی صدیقی کی ایک مختصر ترین نظم کا جو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہے ابتدائی تعارف کے طور پر ذکر کرونگا جس میں باقی صدیقی نے ایک بہت بڑے موضوع کو کچھ اس طرح نظم کر دیا ہے کہ اسکا ترجمہ کرنا تاثیر کے پھولوں کی کلیاں توچ کر بکھیر دینے کے مترادف ہے۔

نظم کا عنوان ہے ''آزادی''

اچیاں کندھاں
ڈک نہ سکن
پھلاں نی خوشبو

اتنی جامع مختصر اور مکمل نظم باقی صدیقی کے کمال فن کی روشن دلیل ہے۔ اسی طرح انکی ایک نظم ''کھوہ پیا وگے'' ربع سکون میں انسانی درجات انکے مقاصد کامیابیوں اور ناکامیوں کی ایسی تصویر کشی ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی جھلک نئی سوچ اور فکر میں انوکھی آنچ کا اضافہ کرتی ہے۔ زندگی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے انسان اپنے اپنے مرتبے اور مقام پر مطمئن یا غیر مطمئن مگر دونوں صورتوں میں یکساں مجبور اس آفاقی گردش کو پورا کرنے میں لگے ہیں جو قضا و قدر کے فرشتوں نے انکے سپرد کر رکھی ہے۔ کھوہ پیاو گے۔

لوٹے پچھے لوٹا بدھا
کوئی پورا کوئی ادھا
ماہلاں نی پھاہی وچ پھاتے
اگے پچھے
پچھے اگے

کھوہ پیا و گے

زندگی عالم اضداد ہے اور نا ہموار راستوں کا نہ ختم ہونے والا سفر جو اپنی دلچسپیوں اور جاذبیتوں سے خالی نہیں مگر اپنی اذیتناک ناہمواریوں اور نا آسودگیوں کے باعث جمالیاتی لذت سے ایک حد تک عاری ہے۔

اس کھوہے نے رنگ نیارے
کیدرے دھپ تے کیدرے تارے
کیدرے نیرا راہ نہ دیوے
کیدرے ٹٹ ٹٹ
دیوا جگے
کھوہ پیا وگے

"اس کھوہے نے راکھے بھے" سبھی لوگ زندگی کو محفوظ یا خوبصورت بنانے میں لگے ہیں اگر کوئی اپنے کمال فن سے اسے پر سکون بنانے میں لگا ہے تو کوئی اور اسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے خوبصورت بنانے میں ہمہ وقت مصروف ہے۔ مگر اسکے باوصف کوئی بھی اس کی اصلیت اور مزاج سے کلی طور پر واقف نہیں ایسا لگتا ہے انسانوں کی کچھ غیر متبدل Types ہیں جو ازل سے چلی آرہی ہیں۔ ہر دور میں وہی چہرے اور وہی کردار بار بار سامنے آتے ہیں اور یہ سلسلہ کہیں اختتام پذیر ہوتا نظر نہیں آتا۔

اس کھوہے نے راکھے بھے
فردی کوئی بھیت نہ لبھے
اوہا مالی تے اوہا لوٹے
رنگ بدل کے
آون آگے
کھوہ پیا وگے

زندگی کے اس گہرے کنویں کا پانی کھیت کھیت کو سیراب کرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے کوئی بند باندھ سکے۔ وقت کو پہچانے اور موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ اکثر پیا سے کھیت اسکے بہاؤ کو روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر عالم امکان کے اس کھیت کی مٹی میں وہی پودا پروان چڑھتا

ہے جسے سیراب ہونے کے لئے با افراط پانی دستیاب ہو سکے پانی کے بغیر جس طرح پودے کو اپنے
پاؤں تلے کی مٹی بھی قبول نہیں کرتی اسی طرح محرومیوں کے شکار انسان کو معاشرے کی فضا بھی
اپنے سینے پر سے ناگوار بوجھ سمجھ کر جھٹک دیتی ہے۔

ٹنی ٹنی پانی جائے
نی نی ڈکا لائے
اوہا بوٹا پھلے پھلے
جس بوٹے آں
پانی لگے
کھوہ پیا وگے

زندگی پر باقی صدیقی کی نظر اتنی گہری ہے کہ اس کے ہر شعر سے حالات و واردات کا کوئی نہ
کوئی ایسا رخ نکلتا ہے جس سے ہر شخص کبھی نہ کبھی ضرور دو چار ہوتا ہے۔ اور اسے ذہن کے
نہاں خانے میں محفوظ پاتا ہے۔ باقی صدیقی کا قاری اپنے گردوپیش کے چونکا دینے والے لمس کو
اپنے اعصاب پر یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے کسی نے اسکے دل کو چھو لیا ہو۔ شاعر کا کمال فن بھی
یہی ہے کہ وہ اپنی آواز کو سب کی آواز اور اپنے دل کی دھڑکن کو سب کی دھڑکن بنا دے اگر
یہ درست ہے تو باقی صدیقی اس جبلی اور فنی صلاحیت کے بڑے شاعر ہیں۔

باقی صدیقی کے پنجابی پوٹھوہاری مجموعہ کلام "کچے گھڑے" میں ایسی نظمیں شامل ہیں۔ جن کا
وجود کسی طرح بھی پنجابی کی کلاسیکی روایت میں لکھی گئی شاعری سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا ہے
باقی صدیقی کی یہ شاعری بالکل نئی چیز ہے۔ اس لئے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی
کہ اسکے سامنے کوئی ماڈل یا آئیڈیل موجود نہیں تھا۔ جس سے انہیں تحریک ملتی انہوں نے ان
نظموں میں ایسے ایسے پہلوؤں سے باتیں کی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد زندگی کے بے پناہ تجربے
اور تخلیقی مہارت پر حیرت ہوتی ہے۔ "باری وچ بیٹھا تکاں" اسی قبیل کی نظم ہے۔ اس نظم میں
شاعر نے جس زاویے سے باتیں کی ہیں ایسے فرد کی باتیں ہیں جو زندگی کی پریشانیوں اور دکھوں
سے پوری طرح آشنا ہونے کی وجہ سے کسی معاملے میں عملاً" شامل ہونے سے گریزاں ہے۔ وہ
دیکھتا سب کچھ ہے۔ مگر مزید عذاب جھیلنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ جو کچھ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر دیکھتا
ہے۔ اسکا اعتراف بھی کرتا ہے۔ اسکا رویہ ایک بڑے بوڑھے۔ شریف انسان کا رویہ ہے جو اپنے
آپ کو کسی واردات میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ سب کچھ ناپسندیدہ ہے مگر

اسکے بس میں نہیں کہ وہ اس میں کوئی تبدیلی لا سکے۔ وہ اپنے گردوپیش میں اصلاح چاہتا ہے مگر اسکے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے دوسروں کو دکھا دے۔

بدل آن تے جھکڑ جھلن
چیڑے اوُن صافے کھلن
تکاں تک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسے حالات میں گھر چکا ہے جو ناقابل اصلاح ہیں۔ نظم کا مزاج علامتی ہے "بدل آن" سے مراد معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں ہیں۔ "جھکڑ جھلن" ایسے حالات کی طرف اشارہ ہے جن میں کوئی شخص عزت و آبرو کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ چیڑے اوُن' صافے کھلن" نہ کسی عورت کی عزت محفوظ ہے نہ کسی مرد کا وقار' "تکاں تک نہ سکاں" دیکھنا چاہوں تو دیکھ نہ سکوں۔

پوری نظم میں معاشرے کی ایسی گھناؤنی تصویر دکھائی گئی ہے جسے دیکھ کر رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے۔

میلی ہوئی چادر چٹی
گلی گلی نی اوُنی مٹی
پھکاں پھک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

ورو حیاتی ڈونگھی کسی
ایہہ دنیائی کھٹی لسی
چھکاں چھک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

باقی صدیقی کی نظم "میں تے میں" انسان کی دوہری شخصیت کا سراپا ہے۔ اندر کا انسان اور باہر کا وہ انسان جسے دوسرے دیکھتے ہیں۔ باہر کا انسان ہمہ وقت مصروف رہتا ہے کہ میرے اندر کی بات کسی پر کھل نہ جائے۔ اس کوشش میں وہ کیا کچھ کرتا ہے اسکا ذکر نظم میں ایسے انداز

سے گیا ہے کہ انسانی نفسیات کا ایک باب کھل گیا ہے۔

شاعر نے اصلیت اور تصنع ظاہر اور باطن کی الگ الگ ایسی پہچان کرا دی ہے کہ اسکے پڑھنے کے بعد کسی قسم کی غلط فہمی انسانی رویوں کو سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

میں انسان
میندھے کئی پچھاویں
ہک پچھاواں
دنیا تکے
ہور پچھاویں میندے اندر شوکن

دنیا کولوں ڈرنا
اوہنا اتے رنگ برنگے پردے پاواں
لا لا کے خوشبوآں
اپنا گند چھپاواں

ایک اور نظم صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے "وڈے لوک" مگر اپنے اندر ایسا تنقیدی رویہ سموئے ہوئے ہے کہ اگر تفصیل میں جائیں تو کئی اوراق کی ضرورت ہو گی پھر بھی شاید اتنی جامعیت سے بات کا ابلاغ ممکن نہیں ہو گا جتنا کہ خود نظم اپنے الفاظ سے براہ راست سمجھا رہی ہے۔

سنگ اتی نا کچا دھاگہ
گل گئے نا پھوگ
فردی سہرا آکھے
کوڑے ہونے وڈے لوگ

زہر میں بجھے ہوئے چھوٹے چھوٹے مصرعے باقی صدیقی کی شاعری کی پہچان ہیں۔ وہ ایجاز گوئی کے دلدادہ ہیں۔ باقی صدیقی کے لئے اردو شاعری ہو یا پنجابی سب برابر ہے۔

بڑے لوگوں سے دوستی کا رشتہ کچے دھاگے سے زیادہ مضبوط نہیں۔ اور ان کی بات گنے کے پھوگ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ تشبیہات نے نظم کے رنگوں کو اور گہرا اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ باقی صدیقی کو کہیں دور نہیں جانا پڑتا انہیں اپنے گردو پیش دیہاتی رہتل ہی سے استعارات

بھی مل جاتے ہیں اور تشبیہات بھی۔

"نظم گنڈی" غلط تقسیم کار اور دربار سرکار میں غلط بخشیوں بغیر استحقاق کے بڑے بڑے عہدوں پہ تقرریوں کی داستان ہے۔ نظم میں طنز کے ایسے تیر پوشیدہ ہیں جو سیدھے اور ٹھیک ہدف پہ بیٹھتے ہیں۔ غیر ذمہ دار اور بے راہ رو معاشرے کو اسکی غیر منصفانہ تقسیم کار، تقسیم زر اور مراتب کے تباہ کن نتائج سے خبردار کرتے ہیں۔

تتے ناپیر چھچے
چھچے ناپیر اگے
ہر ڈھیری ڈنگی
ہر پرزہ ڈھلا
چلے تے سارا پنجر ہٹے
بک گنڈی چلے

ان دی نظم پارے کے مطالب کو میں غیبت کے حوالے سے کھولنا چاہتا ہوں وجہ یہ ہے کہ اس نظم کے مفہوم تک پہنچنے کے لئے یہی راستہ زیادہ صاف اور شفاف ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی دو اشخاص چاہے وہ معاشرے میں کسی درجے پہ بھی فائز ہوں۔ جب مل بیٹھتے ہیں یہ راہ چل رہے ہوتے ہیں۔ تو وہ گفتگو کو اپنے ہی درمیان اپنی اپنی ذات تک محدود رکھیں تو دونوں اپنے اپنے موقف اور وقار کا تحفظ کر رہے ہوتے ہیں اور بڑی احتیاط سے کام لیتے ہوئے بڑے خوشگوار ماحول میں بات کر رہے ہوتے ہیں۔ جونہی ان کی بات آگے بڑھتی ہے اور وہ کسی تیسرے شخص کی ذات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اخلاقیات کے سارے ضابطے اور شرافت کے تمام زریں اصول بھول جاتے ہیں اور اس تیسرے غیر حاضر شخص کو گفتگو میں حاضر کر لیتے ہیں پھر اسے ہر طرح سے ننگا کر کے اسکی ذات، حالات اور معاملات کے حوالوں سے غیر منصفانہ اور غیر شریفانہ طعن و تشنیع اور عامیانہ تمسخر کا نشانہ بنانے لگتے ہیں۔

باقی صدیقی نے اس نظم کا خمیر روزانہ کے مشاہدے سے اٹھایا ہے ایک معاشرتی خرابی کے Hidden Ulcers کی نفسیاتی حوالے سے نقاب کشائی کر دی ہے۔ یہ نظم ایک آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنا ذہن واضح طور پہ پڑھ سکتا ہے کہ وہ خود اپنی زندگی میں ایسے مواقع پہ کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔

"ہاسہ"

نیرا اکھیاں نوٹ گھتے

تے رات کرے ارمان

بک دوئے آں ننگا کر کے

ہسن جد انسان

اندھیرا اور رات اپنے فطری مزاج میں ستر پوشی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ وہ بھی کسی کو اس طرح ننگا نہیں کرتے حالانکہ "نیرا" اور رات دونوں ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں ان کی ناپسندیدگی اسی وجہ سے ہے کہ وہ آنکھوں کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ مگر جب انسان کسی انسان کو روشنی میں ننگا کر کے اس پر ہنس رہے ہوتے ہیں تو رات اور اندھیرے کو بھی شرم آنے لگتی ہے۔ باقی صدیقی کی شاعری کا یہ وصف ہے کہ آپ مفہوم تک تو پہنچ جاتے ہیں لیکن شاعرانہ اثر پذیری کی خوشبو کا صرف جمالیاتی سطح پر احساس کر سکتے ہیں سوچ سمجھ اور وجدان کی گرفت میں نہیں لا سکتے۔ یقین کیجئے اس نظم کے چار مصرعوں میں معانی کے علاوہ جو کچھ بھی موجود ہے وہ باقی صدیقی کی شاعرانہ اور فنکارانہ (Reach) پہنچ کا نادر نمونہ ہے جسکا شاید کوئی نام نہیں۔

باقی صدیقی نے بعض نظموں میں کچھ ایسے کرداروں کا خاکہ بھی کھینچا ہے جو ہر گاؤں شہر اور قصبے میں ہمیشہ موجود ہوتے ہیں یہ تو ہو سکتا ہے کہیں انکے لباس میں فرق ہو زبان میں فرق ہو وہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں مگر اپنی اوپری جلد کے نیچے کردار میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں اسی قسم کے ایک کردار "داود" کی باقی صدیقی نے نہ صرف شناخت کرائی ہے بلکہ اسکا انجام تک دکھا دیا ہے جو ایسے کرداروں کا قدرتی طور پر ہوتا ہے اور نہ ہو تو کم از کم انکے جاننے والے چاہتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہئے۔

اچا شملہ رکھے

چٹے کپڑے لائے

ٹرنا پھرنا فتنہ

ستیاں گلاں جگائے

کوئی کم نہ چھوڑے

راتی سنھاں لائے

فوریں کیکراں تلے

بس کے کمینڑے تاش داود بک معاش

سگے وڈے سارے

اس نے آگے ٹنگے

راہ وچ کھل کے پانی

کڑیاں کولوں منگے

جنھوں کوئی روکے

اتھوں مڑ مڑ تکیے

کسی وچوں فرزیں

جیھی اس دی لاش

داود بک بدمعاش

اسی قبیل کا ایک اور جیتا جاگتا کردار " ماسی مہراں " ہے۔ جو دلوں کا بھید جانتی ہیں اور ان کے پاس ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور موجود ہوتا ہے۔ محبت کرنے والے دلوں کی رہنمائی اور ان کے درمیان حائل مشکلات کو دور کرنا انہیں خوب آتا ہے۔ جب لوگ کھیتوں کھلیانوں گاؤں کی گلیوں اور کوٹھوں کی منڈیروں پر کچھ بھی نہیں دیکھ رہے ہوتے تو بے وقت وہاں کھڑے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے دلوں میں جھانک لیتی ہیں۔ جس کسی کو ایسی کوئی خالہ مل جائے اس کی ساری مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ایسی خالاؤں کو خود کچھ نہیں بتانا پڑتا یہ اپنی چھٹی حس اور اندر کی آنکھ سے بہت کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ انہیں خود ہی پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں اور کس کو ان کی خدمت کی ضرورت ہے۔ آسمان کے نیچے زمین کے اوپر دنیا میں ہر قریے ہر گاؤں ہر قوم اور ہر طبقے میں ایسے کردار موجود ہوتے ہیں۔

ماسی مہراں

گل سن کڑیئے

کوٹھے اتے کھلتی

کس تیں تکیں

واو کولو جھکیں

تیجو ز ایسہ بنے

اکھ نہ مل
مانو نہ چھل
میں جانا ہر گل
سینڈے کولوں نہ شرما
سینڈا دل رازاں نی گور
کھلیاں جایا کس شتے نا بھار
راتی توں سینڈھے گھسار

"مل ناں گھلو" ایسی نظم ہے جس میں زراعت سے مشینی صنعت کی طرف ایسے موڑ کا ذکر ہے جس نے انسان کو پہلے سے زیادہ مصروف تو کردیا ہے۔ مگر بھوک کی شدت میں اتنی حدت پیدا کردی ہے جس میں روحیں تپ رہی ہیں اور جسم گلتے سڑتے اور پگھلتے جا رہے ہیں۔ کھیتوں اور کھلیانوں کو چھوڑ کر "فقطے اور کرے" ملوں اور کارخانوں کی طرف سرپٹ دوڑ پڑے ہیں۔ بیر اور سیف امتنگ کے اشعار گاتی سخی رات رات بھر کی مجلسوں کی جگہ گھٹیا فلمی نغموں نے لے لی ہے۔ نظم کا آخری بند صرف چار مصرعوں پہ مشتمل ہے مگر اس میں بڑے اختصار سے سبھی کچھ سمو دیا گیا ہے۔

انجن کھٹ کھٹ چلے
دل لوہے ناں لوہا ہویا
قروی تھما پیٹ نہ رجیا
مل ناں گھلو وڈیا

صنعتی انقلاب نے انسانوں اور مشینوں کو آمنے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ مشین کی کارکردگی معیار قرار دے دی گئی ہے۔ انسان مشین کے ساتھ مقابلے کی جنگ ہارتا چلا جا رہا ہے۔ اسکے جذبات کچلے جا رہے ہیں۔ مادی ترقی نے انسان کو بے حسی اور بے رنگی کا شکار کر دیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کے پیمانے بدل دیے گئے ہیں۔

پچھلی صدیاں اپنی سچائیوں اور نظریوں کے ساتھ پیچھے رہ گئی ہیں۔ انسان حتمی سچائیوں کو چھوڑ کر RElative Truth اضافی سچائیوں کی پگڈنڈی کے حقیقت کی تلاش سے ہمیشہ کے لئے دست کش ہو چکا ہے۔ صنعتی انقلاب کی آمد آمد پہ مغرب میں ورڈز ورتھ اور کولرج بھی ایک بار چونکے تھے مگر جلد ہی سائنسی کھلونوں کی ایجادات نے سہولتوں اور آرام کی ایسی ایسی شکلیں نکالیں

جنہوں نے نسل انسانی کا ذہن موہ لیا۔ باقی صدیقی کی اس نظم کے آخری بند سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدشات جو مغرب میں شروع شروع میں محسوس کئے گئے تھے اب پوری طرح سامنے آچکے ہیں۔

باقی صدیقی کی شاعری ایک سے زیادہ سطحوں پر قاری کے دامن دل کو کھینچتی ہے۔ پہلی سطح الفاظ کی صوتی سطح ہے جس سے ایک منفرد چاشنی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دوسری سطح محاکاتی ہے کہ باقی صدیقی کے ہاتھ میں الفاظ تصویریں بن جاتے ہیں۔ باقی صدیقی جہاں کہیں کسی مصرع میں چار الفاظ اکٹھے لکھ دیں وہ ایک نادر تصویر بنا دیتے ہیں اس لحاظ سے یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ باقی صدیقی الفاظ کے بجائے تصویریں سوچتے اور لکھتے ہیں تصویریں بھی جامد نہیں زندہ و متحرک اس تناظر میں "کچے گھڑے" کی ایک نظم کپ کڑی دیکھئے!

راہے وچ کڑی کپ تکی
ارماناں نی چڑھتی ڈھکی
اک اک وچ جوبن ہسے
جیوں سریاں نی گندل رسے
کھناں تے دوہاں نی پلی
ساوا سٹ' دوہدی چھلی
سرتے جتی کھل نہ سکے
مست جوانی ٹھل نہ سکے
چار قدم کڑیاں توں اگے
نرلی پھلی سوہنی لگے

ارماناں نی چڑھتی ڈھکی' جیوں سریاں نی گندل رسے' ساوا سٹ' دوہدی چھلی' ایسے استعاراتی مرکبات ہیں۔ جو باقی صدیقی نے دیہاتی رہتل میں عملاً" شمولیت سے حاصل کئے ہیں اور خالصتاً" باقی صدیقی کی ذاتی تراکیب ہیں جو بچپن سے جوانی تک ان کے گھر اور گاؤں سہام کے اردگرد اس وقت تک بکھری پڑی تھیں جب تک کہ شہر کے زہر نے گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں کو اپنی سانسوں سے مسموم نہیں کر دیا تھا۔

اسی تناظر میں ایک اور نظم "کالا بدل چڑھیا" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

میں ناںڈا' توں ساوی چھلی

چار دیہاڑے قسمت رلی
تے قرونیا نے روڑے وچ
میں وی کھادا، توں وی کھلی
کچا فصل سڑیا
کالا بدن چڑیا

مکئی کی فصل جس نے دیکھی ہو وہ صحیح طور پر یہ جان سکتا ہے کہ نانڈے اور ساوی چھلی کا ساتھ کتنا عارضی اور وقتی ہوتا ہے صرف چند دنوں کا ساتھ اور پھر تنہا اپنے اپنے عذاب کو جھیلنا زندگی ہے۔

باقی صدیقی Conceits کنسیٹ تراشنے یا مماثلتیں تلاش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انکی نظم "بڑھاپا" اس سلسلے کی نمائندہ نظم ہے جس میں بڑھاپے کو ویران ریلوے سٹیشن کے مماثل بتایا ہے جب جوانی کی گاڑی اسکی رونقوں میں کچھ دیر اضافہ کر کے اسے ویران چھوڑ تی ہو۔ گاڑی کی آمد کے وقت شور شرابا خوشی کی ایک لہر کی طرح ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ سوئی ہوئی ریل کی پٹڑی بے سدھ سگنل، مردہ اور ویراں پلیٹ فارم یک دم جاگ پڑتے ہیں اور ہر چیز میں کچھ دیر کے لئے زندگی آجاتی ہے۔ مسافر گاڑی سے اترتے ہیں نئے مسافر گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور پھر سب اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ تو پیچھے اس دل آویز منظر کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی سٹیشن پر رہ جائے تو اسکے اعصاب پر جو نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انہیں باقی صدیقی نے جوانی اور بڑھاپے کی علامت کے طور پر جس فنکارانہ مہارت کے ساتھ نظم کیا ہے وہ باقی صدیقی ہی کا حصہ ہے۔ اور پھر یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوتی ہے کہ باقی صدیقی نے یہ سارا مفہوم پوری شعریت کے ساتھ صرف چار مصرعوں میں سمو دیا ہے۔ اور نظم کا مفہوم جذبات و احساسات اپنے قاری پر چھوڑ دیے ہیں۔ کوئی تفصیل یا وضاحت ضروری نہیں سمجھی یہ کمال صرف باقی صدیقی ہی کو حاصل تھا۔

بڑھاپا

گڈی لنگ گئی
تے پچھے رہ گیا
بھاں بھاں کردا ٹیشن

تے شاں شاں کرنے کن

اس نظم میں تو پھر چار مصرعے تھے۔ اگر آپ انکی نظم "آزادی" ملاحظہ فرمائیں تو وہ اس سے بھی زیادہ مختصر الفاظ کا مرقع ہے جو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہے۔ مگر اسکا مفہوم صدیوں کی غلامی اور آزادی کے مابین فاصلے کو کم سے کم الفاظ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ صرف آٹھ الفاظ میں وہ کچھ بیان کر دیا گیا ہے جس پر صدیوں سے لکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔ اسکی حدود و قیود کو متعین کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور آج بھی یہ موضوع اتنا ہی اہم تازہ اور تشنہ ہے جتنا کہ کبھی پہلے تھا۔ باقی صدیقی یہاں اپنی فنکارانہ بلندیوں پر فائز نظر آتے ہیں۔

آزادی

اچیاں کندھاں
ڈک نہ سکن
پھلاں نی خوشبو

زندگی ایک ایسی ہمہ وقتی مصروفیت ہے جسکے کسی کام کا بھی نتیجہ اکثر حسب منشا نہیں نکلتا۔ جب تک جان میں جان ہوتی ہے یا تو ہم کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں یا کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اسکے ساتھ ایک پراسراریت ہمارے حالات اور خیالات کو گھیرے رہتی ہے۔ اکثر ہمیں یہ بھی اندازہ نہیں رہتا کہ یہ جو کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے ہم اسے سوتے میں دیکھ رہے ہیں یا جاگتے ہوئے۔ اس سے ہم صرف اس وقت چونکتے ہیں جب درد کی کوئی ٹیس ہمارے رونگھٹے رونگھٹے میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے درد ہی خود زندگی ہے۔ وجود کا کوئی عضو اس قدر بے حس ہو جائے کہ اس میں درد محسوس نہ ہو تو وہ عضو زندگی سے محروم ہو چکا ہوتا ہے اور جس معاشرے میں دوسروں کے درد کا احساس نہ رہا ہو وہ معاشرہ بھی حقیقت میں مر چکا ہوتا ہے۔ زندگی شروع ہوتی ہے تو اسکے ساتھ ہی دکھ درد اور غموں کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے کبھی کم نہیں ہوتا۔ باقی صدیقی نے نظم "زندگی" میں یہی بات اپنے منفرد انداز سے کی۔

زندگی

چرخہ ڈاہ کے بیٹھی اَجّے
پونی پونی تے دن کھنجے
درد ترکلا لوں لوں سلے
تند قماں نی دوھتی ونجے

باقی صدیقی نے زندگی کی پر اسراریت' مصروفیت اور غم رائیگاں کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس میں شاعرانہ حقیقت اور منطقی حقیقت اتنے قریب آگئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی معنویت میں اضافہ کرنے لگے ہیں۔

کچے گھڑے کی نظموں میں گیت کا سا نرم رواں رواں لہجہ اور لطیف جذبات کا عکس بولتا اور باتیں کرتا سنائی دیتا ہے۔ اور پھر استعارات اور نادر تشبیہات جو باقی صدیقی کی اپنی اختراع ہیں سونے پہ سہاگہ ثابت ہوتی ہیں۔ نظم تانگھ کے دو بند ملاحظہ کیجئے جن میں چاشنی ، الفاظ کا ایسا جادو موجود ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اور پڑھتے ہوئے زبان ایک ایک لفظ سے لذت آشنا ہوتی ہے۔

اچے اچے بوٹیاں تے نکی نکی چانی
رات چنا ریشمی دوپٹہ پئی تانی
چنے وچوں تکی اک تار میڈے بان نی
اکھاں نیاں بجھنی تے دلاں نیاں جانی
اتھے اتھ ہساں تے ونگ ونگ بولنی
دلاں نیاں گنجھاں جوانی پئی کھولنی
ایویں پئی جھلنی تے ایویں پئی ڈولنی
میں تے نہ جاناں پر دنیا تے جانی
اچے اچے بوٹیاں تے نکی نکی چانی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان وقت کے سمندر پر اس طرح زندگی گزارتا ہے جس طرح کسی بحری جہاز کا کوئی Navigator یا ڈرائیور۔ سمندر کے سینے پر جہاز رواں دواں ہوتا ہے۔ اور ڈرائیور اپنے کیبن میں بیٹھے ہوئے اسے منزل کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاز سے

باہر اسے آسمان اور سمندر کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اکثر گہری دھند کی وجہ سے اسے اپنے سامنے ایک گز کے فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آتا مگر پھر بھی وہ اپنی سمت سفر درست رکھتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ جہاز کے اندر اپنے سامنے لگی کمپاسوں' ڈائیلوں رنگوں اور روشنیوں سے سمتوں اور فاصلوں کو جانچتا ہے۔ اسے جہاز سے باہر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس طرح ہر انسان اپنے اندر کی داخلی کیفیات اور اندازوں سے زندگی کے گرم و سرد کا اندازہ کرتا ہے اور اکثر اسکے فیصلے حقیقت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بار آور ثابت نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنے ذہن میں پہلے سے بہت سی تصویریں اور خاکے ٹانگ رکھے ہوتے ہیں جن کے معیار پر ہم اپنے گردو پیش کے حالات' معاملات' اور کیفیات کو پرکھتے ہیں۔ ہماری قوت متخیلہ بھی اکثر دور کی چیزوں کو نزدیک اور نزدیک کی اشیاء کو دور دکھانے میں کمال دکھاتی ہے۔

چھوٹی چیزوں کو بڑا اور بڑی کو چھوٹا کر دکھانا قوت متخیلہ کا خاصہ ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اکثر ہمیں وہ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے جو حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ نفسیاتی کیفیت باقی صدیقی کی نظم "علیکھا" میں کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے۔

اوہ لاری آئی اے
بک گھبرو لتھا اے
اوہا منہ متھا اے
کرتا وی خاکی اے
شملہ وی اچا اے
لاچہ وی سچا اے
اللہ سن کھدی اے
ایہہ میںڈا ماہی اے
نہیں! کوئی راہی اے!

اس نظم میں شوق وصال' ماہی کی آمد کا انتظار تصور کی آنکھ میں وہ روپ دھار کر سامنے آیا ہے جو کسی کی راہ دیکھنے والوں کو اکثر امید و بیم میں مبتلا رکھتا ہے۔ دور سے شملے' کرتے اور ریشمی لاچے سے جو تصویر کسی چاہنے والے کے ذہن کے پردے پر بنتی ہے اس سے پہلی نظر میں یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ نے دل سے نکلی ہوئی دعا سن لی ہے اور ماہی آتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر آنے والا جب ذرا قریب آتا ہے تو آنکھ اسے کوئی اور دکھا دیتی ہے۔ تو بس آس اور امید کے

خیالی غبارے سے خوشیوں اور مسرتوں کے سارے رنگ بھک سے اڑ جاتے ہیں۔

ایہہ   مینڈا   ماہی   اے
نہیں   کوئی   راہی   اے

یہ موضوعات صرف آج ہی کے نہیں انسانی جبلی جذبات اور احساسات کی صورتیں ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہونگی یہ غیر متبدل ہیں۔ انسان ہمیشہ سے ایسا ہی سوچتا اور محسوس کرتا چلا آیا ہے اور ہمیشہ سوچتا چلا جائیگا۔ جہاں جہاں جس نظم میں غزل کے شعر میں یا کسی تصویر میں اس قبیل کے خیال و خواب نقش ہو جائیں گے۔ انسانی ذہن کے لئے ہمیشہ جمالیاتی حظ کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔

کچے گھڑے کے پانچویں باب کا نام "کھیڈن دے دن چار" ہے۔ جس میں دیہات میں اکثر کھیلے جانے والے کھیلوں کے حوالے سے زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس حصے میں جو نظمیں شامل ہیں انکے عنوانات ہیں "چھپن چھوت" "کوڈی" اور "انی ڈنہ"۔

باقی صدیقی کی یہ نظمیں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ بچپن اور جوانی میں کھیلے جانے والے کھیل زندگی بھر ختم نہیں ہوتے۔ اسی طرح جاری رہتے ہیں صرف انکے میدان سامان اور نوعیت بدل جاتی ہے نظم "چھپن چھوت" میں جن مطالب کا اظہار کیا گیا ہے ان میں اتنی افادیت ہے کہ سوچ کے پردوں پر کئی امکانی نقش ابھرنے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے زندگی بجائے خود اپنے مسائل مقاصد اور انکے حصول کا سارا عمل مسلسل "چھپن چھوت" ہے۔ وہی کھیل جو بچپن میں شروع ہوا تھا عمر رسیدگی تک جاری ہے وہی چھپنا چھپانا اور پکڑ دھکڑ اپنی شکلیں بدل کر قدم قدم پر ہمارے ساتھ چلا آیا ہے۔ وہی اندھیرے وہی فاصلے' وہی دیواریں عبور کرنے کا عمل رائیگاں جس کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

دو قدماں دا فاصلہ
بنیا لے پندھ
راہے اگے چڑھ گئی
درمیاں اچی کندھ
ولاں آر بلیساں
ڈگی ڈگی میں
فروی رہیاں چو رائی

چھو نہ سکی میں

بس یہ چھو نہ سکنے کا قلق ایسی کیفیت ہے جسکے عذاب سے بچنے کے لئے ہی تو سارے جتن کئے جاتے ہیں۔

نظم "کوڈی" بھی ایک کھیل ہے مگر اسکے لگے بندھے اصولوں کے اندر انسانی زندگی کے وہ تلازمے بھی موجود ہیں جو کھیل کے طور پر تو اتنے زیادہ وقیع نظر نہیں آتے مگر جب زندگی ذرا کھیل کود کے غیر سنجیدہ سنہرے دور سے آگے بڑھتی ہے تو اس کا سارا عمل "کبڈی" بن کے رہ جاتا ہے ہار جیت کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اور بدلے ہوئے معانی کا عرفان زندگی کی کبڈی کھیلنے والے ہر کھلاڑی کی رگوں میں خون منجمد کر دیتا ہے۔

کوڈی

کوڈی اک ارمان
رنگ برنگے روپ بدل کے کھیڈن سب انسان
کوڈی اک دستور
دشمن گھیرا پا کے آئے جن سن دور
کوڈی اک آواز
جیہڑا وچ پڑے نے لتھا لبھا اس ناراز
کوڈی اک لکیر
جھے لگے تے قسمت' نہیں تے وچ کلیجے تیر

اسی طرح "انی ڈنہ" لڑکپن میں کھیلا جانے والا ایسا کھیل ہے۔ جسے باقی صدیقی نے اپنے تخیل کا رنگ دے کر نئے معانی عطا کردئے ہیں۔ باقی صدیقی معمولی چیزوں میں غیر معمولی معانی تلاش کر لیتے ہیں۔ انہیں بالکل مختلف چیزوں میں ایسی مماثلتیں نظر آتی ہیں جو عام ناظر کی نظروں سے عموماً" اوجھل رہتی ہیں۔

اس روزانہ کے دیہاتی کھیل کو باقی صدیقی نے زمین سے اٹھا کر معانی کے آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ بات فن اور فنکار کی ہے۔ بعض ہاتھوں میں سونا مٹی کی حیثیت نہیں رکھتا اور کچھ ہاتھوں میں مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔ باقی صدیقی قلندر صفت انسان ہیں وہ راہ چلتے درختوں' راہوں' کھیتوں اور کھلیانوں سے بھی باتیں کرتے ہیں۔ مٹی کے ذروں سے لے کر آسمان پر چمکتے

ستاروں تک کے اندر کی بات کو سمجھتے ہیں۔

بچوں کو انی ڈنہ کھیلتے دیکھتے ہیں۔ تو بچوں کی نظر سے نہیں دیکھتے اسے اپنے مزاج کے آئینے میں رکھ کر سوچتے ہیں۔ عظیم شاعری کی تعریف بھی یہی سب سے زیادہ مناسب ہے کہ شاعری شاعر کے مزاج سے منعکس ہونے والی زندگی ہوتی ہے Poetry is life seen through a temprament

بہرحال انی ڈنہ ایک کھیل ہے لڑکے جسے معصومیت کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ کوئی جیت رہا ہوتا ہے کوئی ہار رہا ہوتا ہے۔ پڑنے اور پڑانے کے الفاظ کے معانی کے لئے اردو میں شاید کوئی مناسب الفاظ نہیں ہم اس عمل کو زیادہ سے زیادہ کھیلنا اور کھلانا ہی کہہ سکتے ہیں۔ انی اور ڈنہ دونوں لکڑی کے بنے ہوتے ہیں ڈنہ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور لکڑی کی انی کو کھلاڑی چاہے جتنے زور سے بھی ٹلہ مار دے وہ لمحہ بھر کے لئے کتنی ہی بلندی تک کیوں نہ پہنچ جائے آخر زمین پر واپس آتی ہے۔ مگر جب بڑی ہو کر وہی لکڑی کی "انی سدھراں" نی انی بن جاتی ہے۔ تو کھیلنے والے سارے کھلاڑی وقت کے مقابل کھڑے نظر آتے ہیں اور وقت اسے ایسا ٹلہ لگاتا ہے کہ سدھراں نی انی آسمان کا تارا ہو جاتی ہے۔ اور ساری عمر ہاتھ نہیں آتی۔ انسان چاروں اور پاگلوں کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔

جاتک کھڈن انی ڈنہ
کوئی پڑے
کوئی پڑائے

انی ڈنہ
اج تک کمیڈ تے کل اک بارے
کیاں کمیڈن آپ تے وڈیاں وقت کھڈائے

وقت اجھیا ٹلہ مارے
گاس چڑھے سدھراں نی انی
جھلا ہو کے بندہ
چھچے چھچے دوڑے

ہوش بھلائے

جان گنوائے

اک اسماناں وچ تارا

جھڑ نہ آئے

وقت دا اک کھنڈیار پراتا

ساری عمر پہائے

دکھاں بھیا سواں ڈھولا "کچے گھڑے" کا آخری باب ہے جس میں پانچ نظمیں شامل ہیں جنکی سوچ، آہنگ، رنگ اور لہجہ پنجابی لوک گیتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ مصرعوں میں وہی بے ساختگی اور کاٹ ہے جس کے ساتھ فکر کی لہر کاریز کی صورت گالی گنگناتی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

دکھاں بھیا سواں ڈھولا

چھوڑ دے دیویں بانہہ ڈھولا

میں کھوہے تے پانی گئیاں

توں تکیا تے میں ہس پیاں

گھر گھر بیانیاں ڈھولا

دکھاں بھیا سواں ڈھولا

آس دلے نی تولہ ماشہ

پیر بھلاکا پیٹڑا ہاسہ

اپنی گل دے گماں ڈھولا

دکھاں بھیا سواں ڈھولا

دنیا اپنے اپنے رنگ وٹائے

دھپ چھاں نی چڑھی آئے

کر چھلے نی چھاں ڈھولا

دکھاں بھیا سواں ڈھولا

خالص دیہاتی روش سادہ اور معصوم دلوں کی محبتوں کا عکس مصرع مصرع سے کسی پکار کی طرح شہانہ لہاتا زبان حال سے وہ راز کھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو زبان پر آکر تمت بن جاتا

کرتا ہے۔ صرف الفاظ کے مرکبات سے لطف لے لیجئے تو یہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔

"توں نکیا" میں "جس پیاں"، "گھر گھر پانیاں"، "پیر جھلاؤ"، "تیڈا یاسہ"، "رشتے نی چھاں" سارا کچھ جمالیاتی سطح پر محسوس کرنے کے لائق ہے۔ ترجمہ ان پھولوں کی نازک طبیعت جیسے مصرعوں کو نوچ کر اکی خوشبو بکھیر دینے کے مترادف نظر آتا ہے۔

نظم "بھیا نہ چھیا" ساس کے ساتھ چخ چخ، محبوب کے ساتھ پیار کے سچے رشتے میں جھوٹ کی چھوٹ کا احساس، گاؤں کی آزاد فضاؤں میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زندگی کے رنگوں میں آنے والی تبدیلی، سانجھے کھیت کی فصل کے بٹوارے کا جھگڑا، اس نظم کے چار چوکھٹے ہیں جن میں باقی صدیقی کی پینٹ کی ہوئی تصویریں کچھ اس طرح سجی ہوئی ہیں کہ پورے گاؤں کا دیہی زندگی کی حدت سے دہکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

بھیا نہ چھیا
بھیا اے مکے
نی میں کیوں گھڑائے چھلے
سینڈھی سس نہ دیوں وے
گاؤں کرے تے سینہ سلے
ساری راتی سنجی بلے
یاروں تھا ناجھولا

آیا خوشبوواں نا جھولا
جتی ٹپ تے خاکی چولا
دم سے رتی سنگے تولا
وچوں ٹھگ تے اتوں بھولا

آئے پڑے نے جھوٹے
گڑیاں رتے لال پٹولے
سرسے سے مندری بولے
دناں بیت دئے نے کھوٹے

گلاں نپے' ماہیے' ڈھولے

ڈانڈے نال بھیالی
منگاں حاصل کڈھے گالی
بکے مت' بھڑولے خالی
جمے واندا ں گل پنجابی
ایویں کنگاں ماری لالی

نظم "سرگھی ناویلا" ایسی نظم ہے جس کی خوبصورتی اور نزاکت صبح صادق کے وقت گاؤں کی سوئی سوئی فضا میں اوں اوں بیداری کے آثار اور صاف شفاف ماحول میں خاموشی کی انگڑائی لیتی ہوئی سانس میں اونٹوں کی گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی گونج جو منظر دکھاتی ہے اسے کوئی کیمرہ تصویر میں محصور کر سکتا ہے اور کوئی شاعر الفاظ میں شاید ہی اس طرح ڈھال سکے جس طرح باقی صدیقی نے جیتا جاگتا اور دھڑکتا ہوا پیش کر دیا ہے۔ نہ صرف منظر دکھا دیا ہے آوازیں سنا دی ہیں بلکہ کجاؤں کی رسیوں میں دل اور دلوں میں ارمان کس کے باندھے ہوئے دکھا دیئے ہیں۔

سرگھی نا ویلا ہویا
جاگ پیاں کلیاں
کے تن بلان پیاں
انھاں نیاں ٹلیاں
نمیرے نمیرے چوری چوری
ٹوریاں نے بھار لدے
ٹلیاں وچ ساہ رکھے
رسیاں وچ دل بدھے
دلاں نیاں سدھراں
کجاوے نال ولیاں
سرگھی نا ویلا ہویا
جاگ پیاں کلیاں

باقی صدیقی کے پنجابی مجموعہ کلام "کچے گھڑے" کی آخری نظم کا عنوان ہے "ایہہ نہیں

مینڈا گراں" یہ بات باقی صدیقی نے کسی ایک گاؤں کے بارے میں نہیں کہی صرف اپنے آبائی گاؤں' اپنے بچپن اور جوانی کے گاؤں ہی کو اپنا گاؤں کہنے سے انکار نہیں کیا ہے۔ اور جو وجہ بات نظم کے داخلی کردار دیہاتی لڑکی کی زبانی کہلوائی ہیں باقی صدیقی ہی کی نہیں ہم سب کے دلوں کی باتیں ہیں۔ کھیتوں کی جگہ مکان تعمیر ہو چکے ہیں پانی کے تالاب سوکھ چکے ہیں جو ارد گرد کی آبادی کے لوگوں نے گھروں کے کوڑے کرکٹ سے بھر دیئے ہیں جہاں گھنے سایہ دار درخت ہوا کرتے تھے وہاں زمینیں پلاٹوں میں بٹ گئیں ہیں۔ کہیں کوئی پینگ ہے نہ کوئی جھولنے والیاں ہیں۔ نہ وہ ساجن رہے ہیں نہ سیاں۔ گزری باتوں کو یاد کر کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو دل چیخ اٹھتا ہے۔ "ایہہ نہیں مینڈا گراں"۔

نہ اوہ پینگاں نہ اوہ جھوٹے
نہ اوہ گھرے گھرے بوٹے
نہ اوہ گوہڑی چھاں
ایہہ نہیں مینڈا گراں
پچھیاں گلاں کی دل سہکے
کیویں وچ ترنجن بہہ کے
ڈھولا ماہیا گاں
ایہہ نہیں مینڈا گراں
کھیڈاں سب وچھالے پیاں
نہ اوہ سجن نہ اوہ سیاں
اوہیں پھیرے پاں
ایہہ نہیں مینڈا گراں
کس اگے فریاد کراں میں
کھلی بہہ کے یاد کراں میں
ایہہ نہیں مینڈا گراں

شاعری ہو کہ مصوری' موسیقی ہو کہ بت تراشی سبھی ایسے فنون لطیفہ ہیں جن سے تعلق رکھنے والا کوئی فنکار بھی کسی طے شدہ پروگرام کے تحت کوئی ماسٹر پیس تخلیق نہیں کر سکتا یہ وہ کام ہے جو کسی فنکار کے ہاتھوں ہوتے ہوتے کسی وقت اچانک ہو جاتا ہے اور جب یہ معجزہ ہو چکتا ہے تو فنکار جس کے ہاتھوں اس کی تخلیق ہوتی ہے وہ خود بھی اگر چاہے تو اسے Repeat نہیں کر

سکتا۔ میر تقی میر کے 72 نشتروں کی حقیقت بھی یہی ہے کہ خدائے سخن میر نے زندگی میں ہزاروں کی تعداد میں اشعار کہے اور ہر شعر شاعرانہ بلندیوں کی طرف ایک جست تھا مگر میر شاعرانہ فنی Perfection تک صرف بہتر بار پہنچ پائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میر تقی میر کے اپنے کلام میں ایسا بلند ترین معیار موجود ہے جس پر وہ خود بھی ہمیشہ فائز نظر نہیں آتے ہیں۔ اس لیے کسی ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے مقابلہ کرنا ادبی بدعت ہے اور ایک شاعر کے کلام میں دوسرے شعراء کے آثار و عکس تلاش کرنا تنگ نظری اور سادگی سے زیادہ کچھ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں دوسرے شعراء کے آثار اس کی پہچان نہیں بناتے۔ فنکار کی اصل شناخت اس کے فن کے وہ جاندار حصے ہوتے ہیں جن کی مثال اس کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

اس وضاحت کے بعد کچے گھڑے کی نظموں سے کچھ حصے ملاحظہ کیجئے جن پر نظر ڈالنے سے بحیثیت شاعر باقی صدیقی کے قد کاٹھ کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو گی۔

وقت سمندر چھلاں مارے
کنڈے اتے کھلی حیاتی
کچے گھڑے الارے
رنگ برنگے چمن تے ون سونے سنگ
پانی جلیاں پھیر کے کچے گھڑے تے رنگ
بن تن تے جھکڑ جھلن
چڑے اڈن' صافے کھلن
تکاں تک نہ سکاں
باری وچ بیٹھ تکاں
اچیاں کندھاں
ٹک نہ سکن
چھاواں نی خوشبو
انگ انگ وچ جوبن ہسے
نیوں سرہاں نی کندھ رسے
کھتاں تے دوھاں نی پلی
ساوا سنہ دودھی تھلی
میں تانڈا توں ساوی چھلی

چار دیہاڑے قسمت رلی
تے فر دنیا نے روے وچ
میں وی کھلا' توں وی کھلی
میں ونجارا' میںڈا ونج نیارا
میں تکاں ونگاں نی قسمت
دنیا تکے ونگاں نا لشکارا
میں ونجارا
اپے اپے بوہنیاں تے نمی نمی چانی
رات چنا ریشمی دوپٹہ پئی آنی
جوبن پکی بیری
بیہڑا تکے وٹے مارے
لگ گئی ویہڑے وچ
دنیاں نی ڈھیری
جوبن پکی بیری
سرگھی نا ویلا ہویا
جاگ پیاں گلیاں
کے تن بلاں پیاں
اٹھاں نیاں ٹلیاں

باقی صدیقی کی ڈرامہ نگاری

باقی صدیقی تقریباً" سترہ سال ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے منسلک رہے اس دوران انہوں نے لا تعداد قومی ملی نغمے، فیچر، گیت، اور ریڈیو ڈرامے لکھے۔ پوٹھوہاری پروگرام کے زرعی ملی گیت " بابیا او بابیا" جس کے چند مصرعے اب تک پروگرام "وسنے رہن گراں" کے شروع میں گائے جاتے ہیں باقی صدیقی کی ہی لا فانی تخلیق ہیں۔ 1965ء کی جنگ کے دوران جنگی گیت " سیر چلے پیا بھارت تا سینا ملے پیا" جنگ کے دوران فضاؤں میں گونجتا رہا اور اگلے مورچوں میں غازیوں اور پاکستانی مجاہدوں کے دل گرماتا اور حوصلے بڑھاتا رہا باقی صدیقی کا ہی لکھا ہوا تھا۔ یہ جنگی گیت اور اس کے علاوہ اور بہت سے پوٹھوہاری گیت جو ریڈیو پر نشر ہوتے رہے اب تک ریکارڈ پر ہیں ان کی غزلیں ابھی تک مختلف ریڈیو سٹیشنوں سے وقتاً" فوقتاً" نشر ہوتی رہتی ہیں۔ لوگ اپنے دیئے جلانے لگے / داغ دل ہم کو یاد آنے لگے باقی صدیقی کی اس غزل کا مطلع ہے جسے ملک کی مشہور گلوکارہ اقبال بانو نے گایا ہے۔

باقی صدیقی نے جو اردو اور پوٹھوہاری ڈرامے لکھے اور ریڈیو پر نشر ہوئے سب کے سب تو محفوظ نہیں مگر راولپنڈی ریڈیو سٹیشن کے پروڈیوسر جناب محمد فیاض کیانی، لائبریرین الطاف قریشی اور ساجدہ سمام قریشی، جناب شریف شاد اور فخر عالم نعمانی صاحب کی مدد سے پوٹھوہاری زبان کے تین ریڈیو ڈرامے ریڈیو کے ایک اہلکار جناب محمد صدیق نے اپنے ہاتھ سے ٹرانسکرائب کئے ہیں۔ میں ان حضرات کا خاص طور پر ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے ریڈیو راولپنڈی پر باقی صدیقی کی موجودگی کے کچھ آثار لگن اور ذاتی دلچسپی سے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ان ڈراموں میں سے ایک پوٹھوہاری ڈرامے کا سکرپٹ مجھے پوٹھوہاری پروگرام جمہوری واز کے پروڈیوسر جناب محمد فیاض کیانی نے فراہم کیا ہے اس ڈرامے کا نام ہے "چٹے ککر"

اس ریڈیائی ڈرامے میں کل چھ کردار ہیں' چوہدری نور دین' رشماں' بیگماں' ونجارا' زرینہ اور منسبدار۔ ان کرداروں کا رول ادا کرنے والے فنکاروں کے نام بالترتیب یہ ہیں محمد صدیق دوسا مرحوم' باجی نگہت اقبال' آمنہ' طارق ملک' نسیمہ ہاشمی' اور ارشد محمود مرحوم ان فنکاروں میں سے محمد صدیق دوسا اور ارشد محمود انتقال کرچکے ہیں اور باقی ریڈیو کے پروگراموں میں اب شرکت نہیں کرتے۔

ڈرامہ دیگر علوم و فنون کی طرح یونانی الاصل ہے۔ یونان کے DORIANS اس صنف کے موجد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے دعوی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ڈرامہ ان کی زبان کے

لیے اسے آج تک ناول ہی کہا جاتا ہے۔ بہر حال سب سے پہلا انگریزی ناول نگار ہنری فیلڈنگز تھا جس نے انگریزی زبان میں پہلا ناول لکھا جس کا نام جوزف انڈرویوز تھا۔ ہر ملک میں ڈرامے کی اپنی اپنی کہانی ہے۔ ہندوستان میں کالی داس کو پہلا ڈرامہ نگار کہا جاتا ہے اور آغا حشر کو اردو کا شیکسپئر اور دوسرے ممالک میں بھی الگ الگ ابتدائی کہانیاں ہوں گی جن کو ڈرامے کی بنیاد سمجھا جاتا ہوگا۔ ہمارے پاس مزید تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں اسوقت ہمارا موضوع ریڈیائی ڈرامہ ہے جو ریڈیو کی ایجاد سے پہلے دنیا میں کہیں بھی رائج نہیں تھا۔ ڈرامے کی یہ قسم سٹیج ڈرامے سے بالکل مختلف ہے۔

ہمارے دور میں سٹیج ڈرامہ' ٹی وی ڈرامہ' اور ریڈیو ڈرامہ الگ الگ اپنی پہچان اور افادیت رکھتے ہیں۔ سٹیج ڈرامہ اور ٹی وی ڈرامہ تو سٹیج پر یا ٹی وی سکرین پر آنکھوں کے سامنے فنکاروں کے ذریعے ڈرامائی عمل کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے مگر ریڈیو ڈرامے کو یہ سہولت حاصل نہیں ریڈیو ڈرامہ سٹیج کے بجائے صوتی تاثرات کے ذریعے تماشائی سامع کے ذہن کے پردے پر ڈرامائی آوازوں سے کھیلا جاتا ہے اس لئے ریڈیو ڈرامہ نہ صرف یہ کہ دوسری قسم کے ڈراموں سے اس کی ساخت مختلف ہوتی ہے بلکہ اس کا لکھنا اور کھیلنا بھی بہت سی فنی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔

باقی صدیقی نے ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے اور وہ اتنی خوبصورتی سے پیش کئے گئے کہ آج تک ان کی یاد سننے والوں کے دلوں میں تازہ ہے باقی صدیقی نے اردو اور پوٹھوہاری دونوں زبانوں میں ڈرامے لکھے تھے مگر اس وقت ہمیں صرف تین پوٹھوہاری ڈرامے دستیاب ہوسکے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے پوٹھوہاری ڈرامے "چٹے گھر" کی کہانی یہ ہے کہ چوہدری نور دین گاؤں کی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ہاں اکثر آتا جاتا ہے اور بیوہ ہونے کی وجہ سے اس کی مالی امداد بھی کرتا ہے۔ اس بیوہ کا نام بیگماں ہے جسکے بال سفید ہوچکے ہیں۔ چوہدری کی بیوی رحمتاں کو چوہدری پر بدنیتی کا شک ہو جاتا ہے۔ وہ اصل بات کی توہ لگانا چاہتی ہے۔ ایک دن چوہدری بیگماں کے ہاں جاتا ہے اور اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ بیگماں نے خلاف معمول بالوں کو وسمہ لگا کر سیاہ کر رکھا ہے۔ چوہدری کی اپنی نیت صاف ہے مگر روزانہ آنے جانے اور امداد کرنے سے بیگماں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ چوہدری اس پر لٹو ہو گیا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں چوہدری اس سے پوچھتا ہے کہ اس نے بالوں کو رنگ کر کس کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ بات کھلتی ہے کہ بیگماں غلط فہمی کی بنیاد پر چوہدری کو اپنے اوپر فریفتہ سمجھنے لگی ہے۔ چوہدری ناراض ہو کر چل پڑتا ہے وہ اسے روکتی ہے مگر وہ یہ کہہ کر نہیں رکنا چاہتا کہ وہ تو "چٹے گھر" یعنی سفید

بالوں کو عزت کا نشان سمجھتا ہے اور اسے سفید بال ہی پسند ہیں۔ کالے بال گناہ کی علامت ہیں جب بیگماں چوہدری کو بٹھانا چاہتی ہے تو چوہدری اسے کہتا ہے اب میں کیوں بیٹھوں پہلے جس چیز کے لیے آتا تھا اب وہ رہی ہی نہیں۔ چوہدری نے رشماں کو بتایا کہ وہ بوڑھی بیگماں کے لیے آیا کرتا تھا جوان بیگماں کے لیے نہیں۔ کیونکہ بوڑھی بیگماں اب مر گئی ہے۔ جوان کالے بالوں والی بیگماں کے پاس نہیں بیٹھ سکتا۔ بیگماں ایک بار پھر چوہدری کو آواز دیتی ہے مگر چوہدری کہتا ہے مجھے اب آواز نہ دو تمہاری آواز میں جوانی کی خواہش بول رہی ہے تم نے تو وسمہ لگا کر اپنے (اپنے گھر) سفید بال چھپا لئے ہیں۔ میرے (اپنے گھر) سفید بالوں کو ننگا نہ کر میں تمہاری امداد تو اسی طرح کرتا رہوں گا مگر اب کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔

اس مختصر کہانی کو ڈرامائی شکل میں باقی صدیقی نے اتنی مہارت سے لکھا ہے کہ یہ ڈرامہ ریڈیو پر سن کر بھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے سارا ڈرامائی عمل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ باقی صدیقی نے کسی کردار کے منہ میں کوئی لمبی اخلاقی تقریر نہیں ڈالی چھوٹے چھوٹے جملوں سے ڈایئلاگ تیار کئے ہیں۔ کہانی بغیر کسی پیچیدگی کے شروع سے آخر تک مربوط صورت حال کو پیش کرتی ہے۔ کوئی بات خلاف واقعہ بیان نہیں کی جسے سن کر یہ کہا جا سکے کہ زندگی میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔

باقی صدیقی کا دوسرا ریڈیائی ڈرامہ جس کا سکرپٹ دستیاب ہو سکا ہے اس کا عنوان ہے "کاکا" محمد حسین اس کا مرکزی کردار ہے وہ انگریزوں کے خلاف ہے۔ اور پولیس کو مطلوب بھی۔ وہ رات کو اپنی ماں اور بہن کو گولڑہ گاؤں میں چھپ کر ملنے آتا رہتا ہے۔ انگریز حکومت نے اس کے سر پر انعام بھی مقرر کر رکھا ہے اور اس کی گرفتاری کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے ایک دن وہ گولڑہ آتا ہے اور اپنے دوست کے ہاں شب بسری کے لیے ٹھہرتا ہے۔ اس کا نام اللہ دین ہے۔ جب محمد حسین سو جاتا ہے اللہ دین تھانے میں انگریز پولیس افسر کو اطلاع دیتا ہے کہ محمد حسین آیا ہوا ہے اور اسے آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ انگریز افسر پہلے تو اللہ دین کی بات کا یقین نہیں کرتا مگر تھوڑی دیر بعد اسے یقین ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ساتھ پولیس کی نفری لے کر موقع پر پہنچتا ہے۔ پولیس اس مکان کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔ محمد حسین جب بیدار ہوتا ہے تو پولیس دیکھ کر مکان کے اندر سے فائر شروع کر دیتا ہے۔ پولیس جواباً گولیاں داغتی ہے۔ دیر تک گولیوں کا تبادلہ جاری رہتا ہے۔ انگریز افسر اسے جلدی گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ وہ تھانیدار کو کہتا ہے سردار تمہاری تو سکیم ناکام ہو گئی ہے۔ شام ہو چلی ہے پتہ نہیں محمد حسین کے پاس کتنا اسلحہ ہے اور کب ختم ہوگا۔ محمد حسین کی ماں اور بہن اس کی گرفتاری کی کوشش کا یہ منظر

اور گولیوں کا تبادلہ دیکھ رہی ہیں۔ انگریز افسر آخر کار فیصلہ کرتا ہے محمد حسین اس طرح گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ کافی تعداد میں سوکھی لکڑی مکان کے ارد گرد اکٹھی کر کے مکان کو آگ لگا دی جائے۔ یہ بات محمد حسین کی بہن سن لیتی ہے وہ دوڑ کر تھانیدار کے پاس جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ میں محمد حسین کی بہن ہوں میرے بھائی کو زندہ گرفتار کرو اسے زندہ نہ جلاؤ تھانیدار اسے کہتا ہے اگر تو اسے جلنے سے بچانا چاہتی ہے تو اسے گرفتار کرا دے۔

بہن کا نام کرم جان ہے وہ محمد حسین کو آواز دیتی ہے کہ وہ بندوق پھینک دے اور گرفتاری دے دے۔ بہن بار بار یہی کہہ رہی ہے اور بھائی مسلسل گولیوں کا جواب گولیوں سے دے رہا ہے۔

آخر محمد حسین بہن کی بات مان لیتا ہے اور فائرنگ بند کر دیتا ہے۔ بہن اسے کہتی ہے میرے ویر باہر آجا۔ محمد حسین بندوق پھینک دیتا ہے اور مکان سے باہر آجاتا ہے۔ کرم جان تھانیدار کو کہتی ہے جاؤ محمد حسین کو ہتھکڑی لگا لو مگر تھانیدار آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے میں محمد حسین کے نزدیک نہیں جا سکتا ہو سکتا ہے وہ گولی چلا دے۔

محمد حسین خود تھانیدار کو آواز دے کر کہتا ہے آ مجھے گرفتار کر لے میں زبان کا پکا ہوں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن تھانیدار جواب میں کہتا ہے نہ بھئی نہ۔ اس پر محمد حسین کی بہن کرم جان تھانیدار کو کہتی ہے ہتھکڑی میری طرف پھینکو میں خود اپنے بھائی محمد حسین کو ہتھکڑی لگا دیتی ہوں۔

کرم جان تھانیدار سے ہتھکڑی لے کر آگے بڑھتی ہے اور بھائی محمد حسین کو کہتی ہے آ میرے ویر میرے نزدیک آ میں تجھے گانا باندھوں۔ یہ ہتھکڑی وہ گانا ہے جو تمہارے دوست اللہ دین نے اپنی طرف سے تمہارے لیے بھیجا ہے۔

آ میرے ویر آ۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ !!!

ریڈیو کے جن فنکاروں نے اس کھیل میں حصہ لیا تھا ان کے نام یہ ہیں۔

اختر جعفری' محمد صدیق دوسا' ارشد محمود' طارق محمود' نگہت اقبال' عفت چوہدری' مقصود علی شعلہ' عزیز علوی' اقبال راجہ اور ریاض میشائی۔

باقی صدیقی ڈرامے کا فن جانتے تھے انہیں اس بات کا علم تھا کہ ڈرامہ صرف کہانی بیان کر دینے کا نام نہیں اس میں کرداروں کے عمل اور رد عمل سے زندگی تخلیق کرنا ہوتی ہے۔ اور پھر ریڈیو ڈرامہ سن کر اس کے صوتی تاثرات سے سامع کی تصویر کو ذہن کے پردے پر متحرک دیکھنا اور دکھانا پڑتا ہے۔ اسی عرفان کی وجہ سے باقی صدیقی اپنے ڈراموں کے ڈائیلاگ غیر ضروری حد

تک طویل نہیں ہونے دیتے۔ ہر کردار اپنی بات ایک یا دو چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہہ دیتا ہے . اور یہ چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر ساری ڈرامائی صورت حال کو پوری طرح مربوط کئے ہوئے آگے بڑھاتے ہیں۔ اور کہانی کی تکمیل تک ڈرامائی عمل آگے بڑھتا ہوا قدرتی لازمی نتیجہ پر پہنچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کہانی لکھنے کے مقابلے میں ڈرامہ لکھنا اسی وجہ سے مشکل ہے کہ اس میں کہانی کار خود سامنے آ ہی نہیں سکتا۔ اسے سب کچھ کرداروں کے ذریعے ہی کرنا ہوتا ہے جبکہ کہانی لکھنا مقابلتاً" آسان اس وجہ سے ہے کہ جب کہانی کی کوئی Situation الجھ جائے تو کہانی کار خود راوی کی صورت واقعات اور حالات کے درمیان آ موجود ہوتا ہے اور پیچیدہ صورت حالات کو کسی وضاحت سے آگے بڑھاتا ہے اور جمود کو توڑ دیتا ہے رکی ہوئی کہانی پھر چل پڑتی ہے۔ مگر ڈرامہ نگار کو یہ سہولت میسر نہیں ہوتی۔ اسے ہر سطح کے کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنا ہوتا ہے اور ہر کردار کو شطرنج کے مہروں کی طرح اپنے اپنے خانوں میں رکھ کر ہی آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ کہانی ناول یا افسانہ لکھنے والا شخص کہانی کار ہوتا ہے اور ہمہ وقت کہانی کے ساتھ موجود رہتا ہے مگر ڈرامہ نگار اپنے فن میں سب کچھ ہوتا ہے اور ڈرامے میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے کردار بھی صرف اپنے اپنے ڈرامائی حالات کے حوالے سے ہی دیکھے یا پرکھے جا سکتے ہیں الگ نہیں۔ ڈرامہ نگاری مشکل فن ہے۔ مگر باقی صدیقی نے اپنے علم اور عملی تجربات کی روشنی میں اس فن میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔

باقی صدیقی کے ڈرامہ "کاکا" کا مرکزی کردار محمد حسین قوم گولڑہ سے تعلق رکھتا تھا اور وہ انگریزوں کے یہاں سے نکل جانے کے بعد تک گولڑہ شریف میں حیات رہا آخری عمر میں صوم و صلات کا پابند ہو گیا تھا گولڑہ خاندان کی بڑی مسجد میں اکثر نماز کے وقت دکھائی دیتا تھا۔ میرے ننھیال گولڑہ شریف میں آباد تھے اس ناطے میں نے محمد حسین کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی تھی اور گٹھے ہوئے وجود چھوٹے قد کا دلیر آدمی تھا۔ صرف محمد حسین گولڑہ ہی کی بات نہیں پورا گولڑہ خاندان انگریزوں کے خلاف رہا اور کبھی ان کے تابع فرمان ہو کر نہیں رہا۔ ارد گرد کے تمام گاؤں خاندان گولڑہ ہی کی ملکیت تھے اور اب بھی ان کی بڑی جاگیر ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اعلیٰ مالک تھے۔ غلامی قبول نہ کرنے اور انگریز دشمنی میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اس خاندان سے لڑتا رہا ہے۔ تھانہ گولڑہ پہلے پہل ان ہی کی نگرانی اور سرکوبی کے لیے انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ 1907ء کے گزیٹئر میں جہاں تھانہ گولڑہ اور خاندان گولڑہ کا ذکر ہے وہاں لکھے الفاظ ہی سے انگریزوں کی بدنیتی اور قوم گولڑہ سے نفرت کی بو آتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مارگلہ کی پہاڑیوں کو ان کے

ہاتھوں غیر محفوظ کہ کر گولڑہ قوم کو بدنام کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔ گولڑہ شریف کا پیر خانہ اور دربار کا ذکر 1907ء کے گزیٹئر میں کہیں نہیں ملتا۔ راولپنڈی میں صرف دو خانقاہوں کا ذکر ہے۔ بری شاہ لطیف" اور شاہ چن چراغ"

ایک ریڈیائی ڈرامہ باقی صدیقی نے "دکھ بجھاں ناں" کے عنوان سے لکھا تھا ریڈیو پاکستان راولپنڈی کی لائبریری میں اب بھی محفوظ ہے۔ یہ جب پہلی بار نشر ہوا تھا تو اس وقت ٹی وی ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ریڈیو کو وہ وقعت حاصل تھی جو آجکل ٹی وی کو ہے۔ اس ڈرامے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اسے بار بار لوگوں کی فرمائش پر نشر کیا جاتا رہا۔

جب سے انسانی عقل دماغ سے اتر کر آنکھوں میں آگئی ہے اور لوگوں نے ان چیزوں کو سوچنا سمجھنا چھوڑ دیا ہے جو دیکھنے اور چھونے میں نہیں آسکتیں۔ تب سے ریڈیو کی نشریات کی وہ اہمیت نہیں رہی جو ہوا کرتی تھی۔ اب لوگ آنکھوں سے سوچنے کا کام لیتے ہیں اور ریڈیو ڈرامہ سننے اور سوچنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہر حال خوبصورتیاں اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہیں چاہے انہیں کوئی دیکھتا ہو یا نہ دیکھتا ہو چینی پلیٹ میں پڑی ہو تو بھی اپنی اصل میں میٹھی ہوتی ہے چاہے اسے چکھنے والا کوئی بھی موجود نہ ہو۔

ڈرامہ بہر حال دیکھنے کی چیز ہے اور دیکھا اسی صورت میں جا سکتا ہے جب اسے کھیلا جائے کھیلنے کے لیے کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے افعال و حرکات و سکنات سے مشابہت دلا دیں۔ باقی صدیقی کے لکھے ہوئے پوٹھوہاری ڈرامے "دکھ بجھاں ناں" کو جن کرداروں نے اپنے فن سے سجایا تھا ان کے نام ہیں۔ اختر جعفری' ارشد محمود' طارق محمود' اور ریاض میشائی۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کھیل میں ریاض میشائی ایسا کردار تھا جس نے کتے کا رول ادا کیا تھا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ مگر یوں لگتا ہے کتا اس ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔ ریاض میشائی کا کمال یہ ہے کہ ڈرامہ کتے کے بھونکنے کی آواز سے شروع ہوتا ہے۔ اس فنکار نے کتے کے بھونکنے کو ایسے ایسے شیڈ دیئے ہیں کہ آپ اب بھی باقی صدیقی کا یہ ڈرامہ سن کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ مثلاً "کتا جب بچہ ہوتا ہے تو کیسی آواز نکالتا ہے' جوانی میں کیسی اور بوڑھا ہو کر کیسے بھونکتا ہے اور اگر سردی میں ٹھٹھر رہا ہو تو اس کی کیسی آواز ہوجاتی ہے۔ کتے کی یہ ساری آوازیں ریاض میشائی نے نکالی تھیں۔ ریاض میشائی اردو کے معروف شاعر اور ادیب جناب منظور سیل کے چھوٹے بھائی ہیں۔ براڈ کاسٹر رائٹر اور کمپیئر بھی کچھ ہیں۔

ڈرامہ کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص جو ادھیڑ عمر بادا ہے اس کا بیٹا انور اپنے گاؤں سے دور اور کسی گاؤں میں سوانگ دیکھنے کے لیے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا پالتو کتا

ذبو بھی ہے جو انور کی طرح ہی جوان اور توانا ہے۔ انور سے گاؤں کے ایک اور لڑکے اکرم کی غلط فہمی کی بنا پر دشمنی ہے اور وہ اسے اکثر دھمکیاں بھی دیتا رہتا ہے۔ اکرم انور کو راستے میں روک لیتا ہے۔ اکرم کے پاس پستول ہے انور کے پاس اس کی کلہاڑی۔ تکرار ہوتی ہے اور اکرم انور کو گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ انور کا کتا یہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اکرم اس قتل کے بعد فرار ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں اس کے غم میں رو رو کر مر جاتی ہے۔ انور کا باپ بادا گاؤں چھوڑ کر اس مقام پر جہاں اس کا بیٹا قتل ہوا تھا ایک چھوٹا سا مکان بنا کر اپنے کتے کے ساتھ رہنے لگتا ہے ایک عرصے کے بعد آدھی رات کے وقت بادو باراں کے شدید طوفان میں بادا کا کتا اچانک زور زور سے بھونکنے لگتا ہے اور باہر کی طرف بار بار دوڑتا ہے مگر بارش اور آندھی کی وجہ سے آگے نہیں جا سکتا واپس آکر زور زور سے بھونکتا ہے۔ بادا کتے کو خاموش کرانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ مسلسل بھونکتا چلا جاتا ہے۔ بادا لگاتار کتے کے بھونکنے سے تنگ آکر باہر کی طرف دیکھتا ہے تو اسے کوئی شخص سائے کی طرح لرزتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بادا اسے کوئی بے گھر مسافر سمجھ کر گھر کے اندر لے آتا ہے۔ اس کے لیے آگ جلاتا ہے اسے کپڑے بدلواتا ہے اور اسے قہوہ بنا کر پلاتا ہے مگر اس دوران میں کتا ہے کہ مسافر کو دیکھ کر بھونکے چلا جاتا ہے وہ لمحہ بھر کے لئے بھی خاموش نہیں ہوتا۔

دراصل کتے ذبو نے اپنے مالک انور کے قاتل کو پہچان لیا ہے۔ بادا کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ مسافر کوئی اجنبی نہیں اس کے بیٹے انور کا قاتل اکرم ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کتا اس لئے مسلسل بھونک رہا ہے کہ اس نے تمہیں پہچان لیا ہے جب تم نے انور کو گولی ماری تھی یہ کتا بھی اس کے ساتھ تھا۔ مگر تم نے انور کو ہی قتل نہیں کیا تم نے دو قتل کئے ہیں۔ ایک انور کا اور دوسرا قتل تم نے اپنی ماں کا کیا ہے جو تمہارے فراق میں رو رو کر کسمپرسی میں مر گئی ہے۔ اکرم بادا کو کہتا ہے کہ وہ اسکی ماں کی قبر تک رہنمائی کر دے۔ وہ ماں کی قبر پر دل کھول کر روئے گا اور پھر بادا انور کا بے شک بدلہ لے سکتا ہے۔

اکرم تسلیم کرتا ہے کہ وہ بادا کے بیٹے انور کا قاتل ہے۔ اور اس نے انور کو لوگوں کے کہنے پر قتل کیا تھا۔ بعد میں پچھتاتا رہا ہے بادا اسے بتاتا ہے کہ وہ اگر بدلہ لینا چاہے تو کتے کو صرف اشارہ کر دے تو وہ اسکو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا۔

بادا کہتا ہے کہ طوفان بادو باراں سے وہ اسے بچا کر خود لایا ہے۔ وہ اسے کیسے مار سکتا ہے۔ اکرم جانا چاہتا ہے مگر بادا کے کتے نے اسکا راستہ روک رکھا ہے۔ بادا کتے کو کہتا ہے۔ ذبو اسکا راستہ چھوڑ دے اسے جانے دے۔ یہ اب اپنی آگ میں جل کر مرے گا۔ میں اپنا احسان ضائع

نہیں کرنا چاہتا۔ میری آگ اس پر احسان کر کے آج پوری طرح بجھ گئی ہے۔ باوا کتے کو پکڑ لیتا ہے تاکہ اکرم جا سکے۔

اس ڈرامے میں باقی صدیقی کا فن ڈرامہ نگاری اوج پر نظر آتا ہے۔ ڈایلاگ کے نہایت مختصر جملے مناظر کو اسطرح بنتے چلے جاتے ہیں کہ سامع اپنے ذہن کے پردے پر تصویریں دیکھتا جاتا ہے۔ اور اسقدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ ڈرامائی عمل اپنے سامنے سٹیج پر مشاہدہ کررہا ہے یا سن کر اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ ڈرامے میں جو کہانی کا عنصر ہے اسے دلچسپ بھی بناتا ہے اور سبق آموز بھی۔

باقی صدیقی ڈراموں میں اپنے گرد وپیش سے ایسے کرداروں کو ڈرامے میں لاتے ہیں جن سے ہم اپنے آپ کو الگ نہیں سمجھتے ان سے اعمال ایسے سرزد ہوتے ہیں جو مافوق الفطرت نہیں گوشت پوست کے جیتے جاگتے ہر انسان سے سرزد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً" اکرم نے انور کو قتل کر دیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے اکرم کو انور کے خلاف غلط بیانیوں سے بھڑکا دیا تھا۔

اکرم نے آخر میں خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس نے انور کو لوگوں کے کہنے سننے پر قتل کیا تھا اور اس قتل کے فوراً" بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ سخت پچھتایا تھا مگر اب جرم ہو ہی چکا تھا اور انور زندہ نہیں ہو سکتا تھا شیکسپیئر کے ڈرامہ اوتھیلو میں ڈسڈا مونا کو اوتھیلو نے غلط فہمی ہی میں قتل کر ڈالا تھا۔ کسی معمولی غلط فہمی یا غلط اطلاع پر کوئی چھوٹا یا بڑا ردعمل ہر شخص سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ یہی امکانی ردعمل ہمیں ایسے مواقع پر احتیاط کا درس دیتا ہے۔ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اعمال کے سرزد ہونے سے ردعمل کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اکرم نے انور کو قتل کر کے اپنے جذبات کو ٹھنڈا تو کر لیا تھا۔ لیکن اسکے بعد سکون کی شریفانہ زندگی اس سے بھی روٹھ گئی تھی اور وہ ایک مفرور کی طرح جنگلوں اور ویرانوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی ماں اسکے فراق اور غم میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں مر گئی۔ اور وہ اپنی ماں کے لئے سہارا بننے کے بجائے اذیت اور نہ ختم ہونے والے عذاب کا ذریعہ ثابت ہوا۔

باقی صدیقی کے اس ڈرامے کو سننے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اسکے واقعات میں عمل اور ردعمل کا ایسا مربوط سلسلہ ہے کہ کوئی بات بے جوڑ اور فالتو دکھائی نہیں دیتی۔ ڈرامے کے کردار اور واقعات کہانی کا لازمی حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ڈرامہ پلاٹ کا ڈرامہ ہے۔ جسکے سب ڈرامائی حصوں میں NEXUS OF CAUSE AND EFFECT موجود ہے۔ اس ڈرامے کو سن کر کہانی اور پلاٹ کی پہچان بھی ہو سکتی ہے۔

اگر یہ کہانی ہوتی تو صرف اس حد تک بات کہی جا سکتی تھی کہ۔

"اکرم قتل کر کے فرار ہو گیا اور اسکے بعد اسکی ماں مر گئی" یہ جملہ مختصر کہانی ہے مگر اسی جملے کو اگر یوں کہا جائے کہ۔

اکرم قتل کر کے فرار ہو گیا اور اسکی ماں اسکے غم سے نڈھال ہو کر مر گئی تو یہ پلاٹ ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک کام نہ ہوتا تو دوسرا بھی نہ ہوتا۔ ایک کام دوسرے کے وقوع پذیر ہونے کا لازمی ذریعہ ثابت ہوا ہے۔

بہرحال باقی صدیقی کے جتنے ڈرامے بھی ریڈیو سے نشر کئے گئے۔ ان کی بنیاد نہایت مربوط پلاٹ پر رکھی گئی تھی۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے کچھ ڈرامے کسی کردار کے گرد بنے ہیں اور کچھ محض کہانی کہنے کے لئے مگر دونوں صورتوں میں محض اتفاقی یا حادثاتی واقعات کو ڈرامے کا حصہ نہیں بنایا۔ یہی اسکے ڈراموں کی کامیابی کی اصل وجہ بھی ہے۔

دنیا میں ایسے واقعات وقوع پذیر ہو جاتے ہیں۔ جن کی نوعیت حادثاتی ہوتی ہے اور اچھے ڈرامہ نگار ایسے واقعات یا حادثات کو ڈرامے کا موضوع نہیں بناتے۔ کیونکہ اتفاقی اور حادثاتی واقعات سے ہم کچھ نہیں سیکھ سکتے صرف خوف زدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً" ایک شخص Mitys کے بت نے Argos میں گر کر اس شخص کو اپنے نیچے کچل کر ہلاک کر دیا تھا جو Mitys کا اصل قاتل تھا۔ اس طرح قتل کا بدلہ مقتول کے سنگین بت نے قاتل سے لے لیا تھا۔ مگر اس واقعے سے کوئی پلاٹ ترتیب نہیں پاتا۔ باقی صدیقی نے اپنے ڈراموں میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

جناب پروفیسر فتح محمد ملک ان استادوں میں سے ہیں جو اردو تنقید کو بنیادیں فراہم کر رہے ہیں۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ آہ اور واہ سے بھری پڑی ہے مگر اردو شعر و ادب میں تنقید کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ فارسی ادب قدامت کے لحاظ سے اپنا ایک وقار اور مقام رکھتا ہے مگر فن تنقید سے وہ بھی مولانا شبلی نعمانی کی شعر العجم کی طباعت تک بالکل محروم چلا آیا ہے۔ سب سے پہلے فارسی شعر پر اگر کسی نے سنجیدہ اور وقیع تنقید لکھی ہے تو وہ مولانا شبلی نعمانی ہی تھے۔ اور وہ بھی فارسی کے بجائے اردو زبان میں لکھی گئی۔

باقی صدیقی کے پوٹھوہاری ڈرامے کے بارے میں ٹیلی فون پر میرے ساتھ بات کرتے ہوئے 25-4-99 کو جناب پروفیسر فتح محمد ملک نے بے ساختہ ایک جملہ باقی صدیقی کے فنی محاسن پر فرمایا تھا۔ جسے میں ان کے حوالے سے یہاں درج کرنا اس وجہ سے ضروری سمجھتا ہوں کہ تنقیدی نگاری کا یہ عصر انکا عصر ہے جناب پروفیسر فتح محمد ملک نے بڑی محبت اور عقیدت مندی سے فرمایا تھا "باقی صدیقی" پوٹھوہاری ڈرامہ نگاری کے "بابا آدم ہیں۔" جناب پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ جملہ پڑھ کر جناب عزیز ملک نے ایک لفظ بے ساختہ کہا تھا "لاریب۔"

کلام باقی صدیقی

کو جن فنکاروں نے آواز کا روپ دیا

1- چانن بن کے راہ راہ وچھ گئی پھلاں دی خوشبو	سلیم رضا
2- تجھ بیون راما (الٰی نغمہ)	نجف علی
3- غم اور خوشی کے راستے آ کر جہاں ملے	محمد اختر
4- چولا چھپنے دا	نذیر بیگم راولپنڈی والی
5- وہ کیا آئے گھر میں ہمارے	عشرت جہاں / شوکت مرزا
6- شابا آؤ کم کریے	اینقہ بانو تے ساتھی
7- رسم سجدہ بھی اٹھا دی ہم نے	محفوظ کھوکھر
8- اپے اپے بوٹیاں تے نی نی چاننی	جاوید اختر
9- دل کے لئے حیات کا پیغام بن گئیں	محمد اختر
10- تیرے جہاں کے نظاروں کا ساتھ دے نہ سکا	خورشید بیگم
11- دیکھئے رات کیسے ڈھلتی ہے	ضمیر حسین
12- خبر کچھ ایسی اڑائی لوگوں نے	غلام عباس
13- باپیا دے باپیا	شاہدہ پروین / اینقہ بانو
14- چمن میں شور بہت شوخیٔ صبا کا تھا	سلیم حسین
15- ہم ذرے ہیں خاک رہگزر کے	شوکت مرزا
16- دل کے لئے حیات کا پیغام بن گئیں	سلامت علی
17- داغ دل ہم کو یاد آنے لگے	اقبال بانو
18- اے وادیٔ کشمیر، اے وادیٔ کشمیر	غلام علی

باقی صدیقی کے پوٹھوہاری گیت

باقی صدیقی نے تقریباً" سترہ سال ریڈیو پاکستان کی خدمت میں گزارے۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے پوٹھوہاری اٹک میں گیت لکھے۔ آج وہ گیت لوک ورثے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ باقی صدیقی کے لکھے ہوئے اور ریڈیو پر نشر کئے گئے جو گیت آج تک انہی کے حوالے سے مشہور ہیں ان میں سے چند ایک گیتوں کے مکھڑے یہ ہیں "سرگی تاریاں ہویا جاگ پیاں کلیاں" کے کی بلاں پیاں او تھاں نیاں میاں" "وکناں پیا سواں ڈھونا چھوڑ نہ دیویں بانہہ ڈھولا" "اچے اچے بوٹیاں تے نی نی چھانی' رات چنا ریشمی دوپٹہ پئی تانی" ان گیتوں کے علاوہ اور بہت سے گیت غزلیں اور ملی نغمے باقی صدیقی کے حوالے سے ملک کے معروف گائیکوں اور فنکاروں نے ریڈیو پر گائے ان گائیکوں میں اقبال بانو' اعجاز حسین حضروی' نظیر بیگم پنڈی والی اور عبدالرشید شامل ہیں۔ باقی صدیقی نے گیتوں کے علاوہ پوٹھوہاری ڈرامے اور تقریریں لکھیں جن سے علاقہ پوٹھوہار کی تہذیب تمدن اور ثقافت کو جلا ملی۔

ہوش آیا تو تاریکی میں تھے باقی
کتنی دیر چراغ جلا معلوم نہیں

باقی صدیقی نے تریسٹھ سال عمر پائی 8 جنوری 1972ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ اتنا عرصہ حیات جیسا کچھ بھی تھا۔ معلمی' اداکاری' فوج کی ملازمت' کلرکی' ٹائپسٹ' فلمی مکالمہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے بسر کیا۔ وہ تمام عمر مجرد رہے۔ ایک ذمہ دار انسان کی طرح زندہ رہے اور غیرتمند انسان کی طرح اپنی چھوٹی ہمشیرہ اصغری خانم کی خدمت میں زندگی گزار دی۔"

باقی صدیقی مشاہیر کی نظر میں

باقی صدیقی مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں برصغیر کے مشہور شاعر اختر ہوشیار پوری سید فیضی سید علی عباد نیساں اکبر آبادی اور پروفیسر ماجد صدیقی شامل ہیں۔ اختر ہوشیارپوری نے باقی صدیقی کے عنوان سے جو نظم لکھی اسکے چند اشعار یہ ہیں۔

آئینہ زندگی کو دکھا کر چلا گیا
وہ راتوں رات شمع جلا کر چلا گیا
کیا شخص تھا کہ ساحلوں کی گیلی ریت پر
موج رواں پہ نقش بنا کر چلا گیا
آواز دیتا رہ گیا ہر سایہ دھوپ میں
اور وہ کہ سب سے آنکھ بچا کر چلا گیا
ان زرد موسموں کے بلا خیزیوں میں بھی
بنجر زمین میں پھول اگا کر چلا گیا

اختر ہوشیار پوری کی خوبصورت نظم روزنامہ جنگ راولپنڈی کے 13 اپریل 1992ء کے پرچے میں چھپی تھی۔ اردو فارسی کے شاعر ادیب اور جانے پہچانے ریڈیو اور ٹی وی کے براڈ کاسٹر سید فیضی نے بزبان فارسی باقی صدیقی کے لئے یہ دو قطعات لکھے ہیں!

بیاد باقی جنش بجانی
خوشا در بزم یاراں شعر خوانی
مقام رفعت باقی بدانم
جہاں فانی و باقی جاودانی

گدائے بود از خود بے نیازی
شہید جستجوئی سوز و سازی
زمن از باقی ء مخزوں چہ پرسی
چو موج گل ہمہ گلشن نوازی

سید علی عباد نیساں اکبر آبادی جناب نیر اکبر آبادی کے بیٹے ہیں نیر خود اردو شاعری کے

اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ پاکستان بننے پر یہاں تشریف لائے اور راولپنڈی کی کوئی شعری نشست اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک جناب نیر اس میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ انکا راولپنڈی میں 1968ء میں انتقال ہوا تھا۔ بہرحال نیساں اکبر آبادی نے باقی صدیقی کی وفات پر جو قطعہ تاریخ رقم کیا تھا یہ ہے۔

جس کو سب کہتے تھے باقی آج فانی ہو گیا
تھا جو کم آمیز اور گوشہ نشین و کم سخن
شاعر خوش گو غزل کے رنگ میں تھا منفرد
جس کو اردو سے تھی الفت جس کو اردو سے لگن
ہاتف غیبی کی میرے کان میں آئی صدا
"خلد میں ہے دیکھئے وہ باقی • رنگیں سخن"

(1972ء)

یہ قطعہ تاریخ سید علی عباد نیساں اکبر آبادی کی کتاب "درج تاریخ" کے صفحہ 80 پر درج ہے۔

پروفیسر عابد صدیقی کی نظم کے اشعار بنام باقی صدیقی

نپک شعلے سی اور خوشبو تھی اس میں مونیے جیسی
سخن میں نرم تھا جیسے جبینیں نرم ہوتی ہیں

عزائم اور عقائد میں صلابت تھی تنے جیسی
وہ تھا خالق ایسا لفظ کی اولاد تھے جس کے

باقی صدیقی کی کتاب "زخم بہار" کا پیش لفظ سر آغاز کے عنوان سے مختار صدیقی نے لکھا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں پہلے تو غیر محسوس اور پھر واضح اور محسوس طور پر جناب باقی صدیقی نظم گوئی سے دست کش ہوتے ہوتے غزل کے پرستار بنے ہیں۔ باقی صدیقی کی غزلیات میں مطالب اور اظہار مطالب کا سلیقہ حسن تناسب اور صداقت شعری کا احساس ہر جگہ کارفرما ہے۔ اسی سلیقے اور حسن تناسب کے احساس نے جناب باقی صدیقی کی غزلیات کو ایک اور انفرادی خصوصیت بخشی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کی غزلیات سے ایک خاص شعری کردار نمایاں ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔ باقی صدیقی نے اس شعری کردار کی تہذیب و تشکیل زندگی کے ذہنی تجربات،

ت کی ہے وہ بہت کم ان اشعار سے جھلکتے ہیں۔ غم جاناں کی ابتداء انتہا اور اس کی نہج کا بھی زیادہ سراغ نہیں ملتا۔ کیونکہ باقی صدیقی اس قبیل کی عاشقانہ حکمت عملی کے "بقا" قائل نہیں۔ لیکن اس استقامت اور تڑپ کا کرشمہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا صمیم انداز پیدا ہو گیا ہے۔

رشید نثار جو ایک معروف شاعر ادیب اور محقق ہیں نے "کتنی دیر چراغ جلا" کے عنوان سے تحریر کیا ہے باقی صدیقی نے بیشتر شاعری براہ راست عوامی زندگی کے استفادے کے لئے تخلیق کی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ پنڈی کی شاعری ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر کھلیانوں اور کھیتوں میں پہنچی۔ اور باقی کی افادیت دوسرے شہروں میں بھی تسلیم کی گئی۔ باقی اپنی زندگی میں دکھ سہتا رہا۔ شعر کہتا اور ایک بے ریا انسان کی طرح دکھ سکھ سہہ کر آتش فشاں بنتا گیا باقی نے ذہنی تصویروں کے ذریعے سے نہیں سوچا بلکہ اس کی شاعری حواس خمسہ کے ذریعے ظاہر ہوئی ہے لہٰذا اس شاعری میں ایک دنیا بجتی جاتی ہے۔ اور اسکی تمام شاعری قبولیت کے لئے ہے۔ بلکہ وہ شخصیت کا شکار نہ ہو کر مادی کائنات کے حقائق کو قبول کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ اور بچوں کی سادگی اور چیزوں کو براہ راست دیکھنے پر ضد کرتا ہے۔ اس طرح باقی صدیقی نے پختہ تہذیب یافتہ ذہن کی پیچیدگی اور بچوں کے ذہن کی سادگی کو شعر کے ذریعے پیش کیا ہے۔

راولپنڈی کے ادبی حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت محبوب اختر باقی صدیقی کے فن اور شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ باقی صدیقی کی وفات کے بعد جب ادبی تحریک راولپنڈی نے انکی کتاب "کتنی دیر چراغ جلا" شائع کی تو انہوں نے باقی صدیقی کے عنوان سے ایک تحریر میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا جو کتاب میں شامل ہے۔ محبوب اختر رقم طراز ہیں۔ باقی کی انفرادیت' اسکی سادگی اور سچائی دکھی انسانیت کے درد کو بانٹنے کے بے پناہ احساس میں سموئی ہوئی ہے دیہات کے سادہ اور معصوم ماحول نے باقی کو حق بات کہنے میں جرات اور بے باکی بخشی ہے۔ اس لحاظ سے باقی اپنے دور کے ہم عصر شعرا کے مقابلے پر ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔

ہماری اردو غزل میں تصنع اور بناوٹ ایک لازمی عنصر کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر باقی نے اردو غزل کو حقیقت کی تلخی اور سچائی بخشی ہے جس سے باقی کے فطری اجتہاد کی نشان دہی ہوتی ہے۔

ایوب محسن راولپنڈی کی ادبی فضا پر ایک عصر چھائے رہنے والے معروف شاعر ادیب اور محقق ہیں۔ راولپنڈی میں اس وقت انکے مقابلے کا عروضی اور کوئی نہیں۔ جناب ایوب محسن نے باقی صدیقی کے نعتیہ کلام پر مشتمل مجموعہ "زاد سفر" کا پیش لفظ لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں باقی صدیقی کا حمدیہ اور نعتیہ کلام ان کی وفات کے گیارہ سال بعد شائع ہو رہا ہے۔ اگر باقی صدیقی نے اپنی نظم و غزل کو ظاہر کیا اور حمد و نعت کو پردے میں رہنے دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے کہ جو بات وہ غزل میں کہنا چاہتے تھے وہ سب کے سننے کی تھی اور جو بات انہوں نے حمد و نعت میں کہی ہے وہ اپنے رب سے تھی یا عقیدتوں کا اظہار اپنے رسول ﷺ کے سامنے تھا۔ ظاہر ہے پردے کی بات وہ محفل میں کیوں کہتے۔

باقی صدیقی نے غزل کہی ہو یا نعت لکھی ہو۔ انہوں نے اپنے اسلوب اور انداز بیان سے دونوں جگہ یکساں وفاداری برتی ہے۔ الفاظ کی جو سادگی غزل میں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ بات چیت کرنے کا جو انداز عام اشعار میں ہے وہی نعتیہ اور حمدیہ شعروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو ٹھہرا ٹھہرا لہجہ ادھر نظر آئے گا وہی ادھر بھی ہے۔ طوفانی جذبات کو دبا دینے کا فن باقی کو خوب آتا ہے۔ احساس کتنا ہی شدید ہو ان کے الفاظ نرم اور دھیمے ہی رہتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں تاثیر اور کاٹ کی کمی نہیں آنے پاتی۔ ابلاغ کی یہی انفرادیت باقی صدیقی کو شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے باقی صدیقی کے نعتیہ مجموعہ کلام پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔
باقی صدیقی کی غزل گوئی محتاج تعارف نہیں اس لحاظ سے اس کی حمدیں اور نعتیں اور مناجاتیں' بھی محتاج تعارف نہیں ان کے تیور ان کا حسن سلوک اور انداز بیان سب کچھ غزل کا سا ہے۔۔ اس دور کی غزل کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ باقی غزل کہنے پر صحیح معنوں میں قادر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی حمدوں مناجاتوں اور خاص طور پر نعتوں میں جو انتہا درجے کی تاثیر ہے وہ اس کے کمال غزل گوئی کی دین بھی ہے اور عشق و عقیدت کے حوالے سے اس کی مکمل سپردگی کے خوبصورت جذبے کی بھی۔

رائے منصب علی خان نے لکھا ہے آج کے دور میں کچھ ڈھنڈورا پیٹنے "یا رولا گولا پاون" والے لوگ بھی ضروری ہوتے ہیں۔ باقی صدیقی کے ساتھ "رولا گولا پاون" والے لوگ نہیں ہیں پر شاعری کی دولت ایسی ہے جس میں شاید ہی کوئی اور آسانی سے باقی کا مقابلہ کر سکے۔

باقی صدیقی کی پنجابی پوٹھوہاری شاعری کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے منیر

احمد شیخ نے "ہنیریں حس دی شاعری" کے عنوان سے لکھا ہے۔ باقی صدیقی چھٹی حس کا شاعر ہے۔ اس کے اشعار کی سلیس پنجابی یا سلیس اردو کریں گے تو اسکے ٹکڑے ہو جائیں گے اور اسکی خوشبو اڑ جائے گی۔ اسکے ٹکڑوں کو جوڑ کر اس کا مفہوم تو شاید کچھ نکل ہی آئے مگر وہ نرا مفہوم ہی ہو گا جو امتحان کے پرچے میں بیان کریں تو دس میں سے دس نمبر مل جاتے ہیں۔ میں نے باقی صدیقی کی شاعری کو نمبر لینے کے لئے نہیں پڑھا۔

باقی صدیقی کی شاعری کو میں نے ایک سے زیادہ سطحوں پر محسوس کیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ شاعر نے الفاظ کو استعمال میں لاتے ہوئے ان کو ایک سے زیادہ سمتیں دی ہیں۔ پڑھتے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے الفاظ بارش کے قطروں کی طرح آہستہ آہستہ برس رہے ہیں۔ پڑھنے والا جذبے سے ان رنگوں میں نہا جاتا ہے جو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں سے چھلک چھلک کر بہہ رہے ہوتے ہیں۔

منیر احمد شیخ لکھتے ہیں۔ اگر آپ مجھے مصوری کی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں موں گا کہ باقی صدیقی کی شاعری واٹر کلر یعنی "پانی رنگیاں" تصویریں ہیں جن میں کہیں کہیں ذرا تیز برش لگا کر گہرے جذبے کو نکھار دیا گیا ہے۔ عام طور پر اس نے ہلکے رنگ ہی استعمال کئے ہیں۔ جن سے جذبات کے خوبصورت اور کبھی کملائے ہوئے اور کبھی دکھوں اور غموں کے آثار نئے نکھرے سامنے آتے ہیں۔ چوڑیوں کی چھنک دلوں کے بھید کھولتی ہے۔ تو سرمہ آنکھوں میں ہنستا ہے۔ ہاتھوں کی مہندی کچھ کہتی ہے تو باتوں باتوں میں ٹپے ماہئے اور ڈھولوں کے رنگ اپنے سارے رویوں کو جوڑ کر ایک ہی روپ بنا دیتے ہیں۔

رشید نثار کی مرتب کردہ کتاب وادی پوٹھوہار میں قرۃ العین طاہرہ کا ایک مضمون "باقی صدیقی" کے عنوان سے شامل ہے انہوں نے باقی صدیقی کے فن اور شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

باقی صدیقی کی مجروح انا انہیں زندگی کے مختلف تجربوں اور مشاہدوں کا نظارہ کراتی ہے۔ ان کے نزدیک خود زندگی ایک تلخ حادثہ ہے۔ باقی کی غزل میں عہد حاضر کے معاشرے کی تمام تکلیفیں، گھٹن، حبس، تعصب، جھوٹ اور ریاکاری سب کی نشاندہی ملتی ہے۔ وہ محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ اور محبت صداقت کی امین ہے یہی سچ ان کی غزل میں نمایاں ہے یہ اور بات کہ سچ کہتے ہوئے کبھی تو ان کے لہجے میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ تو کہیں طنز اور کبھی کبھی بیچارگی بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس بات سے آگاہ ہیں۔ کہ صداقت کا طلب گار کوئی نہیں۔

لے کر بیاض کیوں نہ پکاروں گلی گلی
میرا لہو خرید و میرے شاہکار لو

عزیز ملک نے اپنی کتاب "کارواں" میں "شاعر پوٹھوہار" کے عنوان سے لکھا ہے۔ انہی دنوں (1932ء سے 1936ء) بمبئی میں اس نے (باقی صدیقی) نے آل انڈیا مشاعرہ بھی پڑھا جس کی روداد دکن کے کسی ماہنامہ میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی اور باقی کی نظم کو حاصل مشاعرہ قرار دیا گیا۔ اتفاق سے اس نظم کے چند اشعار میرے ایک حیدر آبادی دوست سید امیر علی کو یاد رہ گئے۔ ان سے حاصل کر کے آپ کی ضیافت طبع کے لئے درج کرتا ہوں۔

یہ لطف کشا کش کیا کم ہے سامان سکوں حاصل نہ سہی
کشتی کا کوئی وارث تو ملا طوفاں ہی سہی ساحل نہ سہی
رکتے ہی فنا ہو جائیں گے یا رستے میں کھو جائیں گے
ہم لطف سفر کے عادی ہیں رہبر نہ سہی منزل نہ سہی
بوندوں کا ترنم بھی ہے وہی کلیوں کا تبسم بھی ہے وہی
دنیا کے تقاضے باقی ہیں وہ ہم نہ سہی وہ دل نہ سہی
ماضی کی فسردہ یادوں سے کیوں خون کریں مستقبل کا
محفل تو سجانی لازم ہے وہ پہلی سی محفل نہ سہی

عزیز ملک لکھتے ہیں 1945ء میں باقی صدیقی نے غزل کو اپنایا اور چار پانچ ہی برس میں غزل گو کی حیثیت سے بام عروج کو جا لیا۔ اپنی زندگی اور فن کے بارے میں باقی خود لکھتا ہے۔ "زندگی میں اس قدر مصائب دیکھے ہیں کہ خود اپنے لئے مصیبت بن گیا ہوں۔ شاعری کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں کیوں کہ اس دنیا میں مجھے یہی کچھ ملا ہے اپنے اشعار جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ زندگی کی مسلسل ناکامیوں نے میری شاعری کو سراپا درد بنا دیا ہے۔ غزل مجھے اتنی پسند ہے۔ جیسے کہ میری منزل یہی تھی۔ اور اسی کی جستجو میں اتنا عرصہ بھٹکتا رہا۔ پہلے میں نے جتنی ناکامیوں کا سامنا کیا آج میری غزل اتنی ہی زندگی کے قریب ہے۔ میں نے گزشتہ ایک ایک تجربہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے"۔

ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی کے مدیر ادیب' شاعر اور معروف نقاد قمر رعینی نے ایک مضمون میں تحریر کیا تھا۔ باقی صدیقی نے پوٹھوہاری زبان میں ایک تشبیہہ ایسی دی ہے جو اردو

اور فارسی میں بھی نہیں ملتی۔

اچے اچے بوٹیاں تے نمی نمی چانی
رات چٹا ریشمی دوپٹہ پئی تانی

درختوں پر مدہم مدہم شفاف چاندنی کو یہ کہنا کہ رات سفید ریشمی دوپٹہ تان رہی ہے۔ خوبصورت بات ہے۔ محبوب کی ہنسی کو پھولوں کی بارش سے مشابہ بتانا ندرت بیان کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ایسی تشبیہات کو وجدانی تشبیہات کہتے ہیں۔

ہنسی تیرے قہقہوں کی آواز
یہ پھول کہاں برس رہے ہیں

1952ء میں باقی صدیقی کی کتاب دارورسن چھپی تو انہوں نے 16-1-1952 کو اپنے دستخطوں کے ساتھ پروفیسر جمیل ملک کو پیش کی تھی۔ پروفیسر جمیل ملک نے باقی صدیقی کے فن اور شخصیت پر ایک خوبصورت مضمون بعنوان "کچی درویش باقی صدیقی" 1972ء میں انکی وفات کے بعد لکھا تھا۔

انہوں نے تحریر کیا تھا۔ باقی صدیقی نے کسی مستقل نقطۂ نظر سے وابستگی کے بجائے ہمیشہ اپنی ذات کو تجربات کی جولانگاہ بنایا ہے۔ اس نے اپنے دل کی ڈھال پر وقت کا ہر وار روکا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی مسلسل ایک سانحہ بنتی چلی گئی ہے۔ مگر اس نے ہر موڑ پر اپنی داخلی توانائی 'اپنی انا' اور اپنی تخلیقی قوت ہی سے راہنمائی حاصل کی ہے۔ تجربات کی اس ریل پیل میں وہ ریزہ ریزہ ہوا ہے مگر انہیں ریزوں کو چن کر وہ ایک ایسا آئینۂ فن بنانے میں بھی سرخرو ہو کر نکلا ہے۔ جس میں باقی کا دیدۂ بینا اور ضبط نفس پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ اور ہر ہر قدم پر اس عہد کی لحظہ بہ لحظہ زوال پذیری اور اقدار حیات کی لحہ بہ لحہ پامالی کی تصویریں رنگ در رنگ اور آہنگ در آہنگ اس کے آئینۂ فکر و فن میں ابھرتی چلی آرہی ہے۔ یہ تصویریں دارورسن' بہار اور سحر کی زخم زخم' سرخ سرخ اور داغ داغ تصویریں ہیں۔ اور یہ آہنگ ایک زہر خند کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر بکھر کر بنتا اور سنورتا ہوا آہنگ ہے۔ رنگ و آہنگ کی یہ عمارت شاعر نے اپنے جسم و جاں کے چونے گارے سے تعمیر کی ہے۔ وہ بظاہر محفل بہار سے اٹھ کر جا چکا ہے مگر در حقیقت اس کی روح بہار بزم میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہے۔ جسکی خوشبو امر ہے۔

بہار بزم میں تحلیل ہوگیا ہوں میں
کہاں ہیں بزم سے مجھ کو نکالنے والے

جمیل یوسف ملک کے مشہور شاعر اور نقاد ہیں۔ ان کا لکھا ہوا ایک مضمون باقی صدیقی کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلہ اوراق میں چھپا تھا۔ جمیل یوسف رقم طراز ہیں۔

اب نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ باقی صدیقی اردو غزل کے دل پذیر شیوہ گفتار اور اس صنف سخن کی سحر انگیز خوبی ء اظہار کی باقیات میں سے تھے۔ ان کے طرز کلام کے اس پہلو کی کچھ مناسبت ان کے تخلص سے ضرور تھی۔ ان کے اشعار میں اظہار و ابلاغ کی سیدھی سادھی بے تکلف اور صداقت پر مبنی جو ایک کیفیت ہے۔ اس سے اب اردو غزل بوجوہ دور ہوتی جارہی ہے۔ اس کے مطالعے سے قدم قدم پر قاری پوری مسرت و انبساط کے ایسے کیف بار لمحات میں ڈوب جاتا ہے۔ جو صداقت کی دریافت سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

اپنے فن کے بارے میں باقی نے جو بات دوستی کے ضمن میں کہی تھی وہ اچھی شاعری پر بالعموم اور ان کی اپنی شاعری پر بالخصوص صادق آتی ہے۔

دوستی خون جگر چاہتی ہے
کام مشکل ہے تو رستہ دیکھو

باقی صدیقی ان شعراء میں سے ہیں جن کو جاننا خود قاری کیلئے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ قاری صحیح معنوں میں سخن شناس ہے اور یہ کہ اس نے اپنے ذوق و شوق کو بے کار صرف نہیں کیا۔

اردو اور پنجابی زبان کے معروف شاعر اور کالم نگار افضل پرویز باقی صدیقی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ باقی صدیقی برصغیر کے چند اعلیٰ پائے کے غزل گو شعراء میں سے تھے۔ لیکن وہ چونکہ کسی خاص گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے اور بد قسمتی سے پوٹھوہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اس لئے انہیں وہ شہرت نہ مل سکی جو انکا حق تھی۔ وہ پنجابی کے بھی اعلیٰ شاعر تھے۔

جس زمانے میں شجاعت علی صدیقی ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ اکثر مشاعرے اور ادبی علمی مجالس برپا کراتے رہتے تھے۔ ملٹری اکاؤنٹس کے ایک مشاعرے کی صدارت حفیظ جالندھری کر رہے تھے۔ باقی صدیقی اپنا کلام سنانے سٹیج پر تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی غزل پڑھتے ہوئے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔

آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میر کارواں ٹھہرے

حفیظ یہ شعر سن کر مسند صدارت پر اچھل پڑے اور بہ آواز بلند داد دیتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا۔ "باقی تمہارا یہ شعر قضا و قدر کے فرشتوں نے آسمانوں پر لکھ دیا ہے"۔ باقی صدیقی کو اس شعر کی داد دینے میں جس فیاضی سے حفیظ نے کام لیا غیر معمولی تھی۔

احسان دانش نے باقی صدیقی کے پہلے مجموعہ کلام کے پیش لفظ میں لکھا تھا "باقی صدیقی ایک خاموش، شریف اور گوشہ نشین قسم کے انسان ہیں نہ وہ ہشتور ہیں نہ وہ چاپلوس، منکر نہ متزلزل انہیں عصری نقائص اور فطری محاسن کے باعث وہ اردو ادب کی دنیا میں کم متعارف ہو سکے ہیں اور اگر ان کا یہی عالم رہا تو شہرت کے اس مقام کو نہ دیکھ سکیں گے، جو ان کے شایان ہے ممکن ہے کہ مستقبل کا نقاد اس قسم کے خالص جوہر کو ادب کے گنجان جنگل سے چن کر نکال لے۔

ہر رنگ جہاں سے ہٹ کے دیکھو
اس طرح نظر نہ آئیں گے ہم
(باقی صدیقی)

پروفیسر فتح محمد ملک نے اکتوبر 1965ء میں "جدید غزل میں باقی صدیقی کی آواز" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو اب انکی کتاب "انداز نظر" کے صفحات 62 تا 69 کی زینت ہے:

پروفیسر فتح محمد ملک رقم طراز ہیں۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا۔ باقی صدیقی کی غزلیات کا پہلا انتخاب ہی اس نظریہ کی فکری خامی کو عملاً" آشکار کرتا ہے۔ باقی صدیقی چالیس برس کی عمر تک نظم میں طبع آزمائی کرتے رہے اور فنی ریاض کے ثمرات سے جھولی بھر کر غزل پر فریفتہ یوں ہوئے کہ

دل کا ہر زخم بول اٹھتا ہے
جب گزرتا ہے کاروان غزل

باقی صدیقی غزل کیا کہتے ہیں۔ دل کے زخموں کو لب گویا عطا کرتے ہیں - باقی صدیقی کے ہاں نہ تو معاملات عشق کی نمائش کا جذبہ کار فرما ہے، نہ کسی پیکر جمال کے خطوط کو یاد کر کے ترستے رہنے کی کیفیت ہے۔ اور نہ ہی زخم خوردہ انا پر تعلی کے پھاہے رکھنے یا گلوگیر آواز میں

حالات کی ستم کاری اور نا قدری ء عالم پر شکوہ سنج رہنے کا رویہ ملتا ہے۔ وہ ان تمام مراحل میں شخصی وقار اور شرافت نفس کی ایک خاص سطح سے نیچے اترنا پسند نہیں کرتے۔ لہجے کا تعین انداز بیان کی نشتریت اور پاس وضع کا التزام ان کی شاعرانہ شخصیت کے نمایاں جوہر ہیں۔

باقی صدیقی کی تصنیفات میں جام جم' دارورسن' زخم بہار' زاد سفر (مجموعہ نعت) کچے گھڑے (پنجابی کلام) کتنی دیر چراغ جلا شامل ہیں۔

انکے فن اور شخصیت پر لکھنے والے حضرات کے اسمائے گرامی ہیں۔

ایوب محسن انہوں نے دارورسن پر بھرپور مقالہ لکھا۔

تجمل حسین اختر نے باقی صدیقی کے مقام کی ٹوہ لگائی۔

احمد شمیم نے کچے گھڑے پر انگریزی زبان میں مقالہ لکھا۔

فتح محمد ملک (پروفیسر) کا مقالہ ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہوا۔

افضل پرویز نے باقی صدیقی کی تصنیفات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔

جمیلہ شاہین نے باقی صدیقی کے فکری تناظر کا حالات کی روشنی میں جائزہ لیا۔

محبوب اختر نے باقی صدیقی کی درویشی اور خودداری کو خراج پیش کیا۔

عزیز ملک نے ان کی شخصیت اور واقعات کا جائزہ لیا۔

نجمی صدیقی نے باقی صدیقی کے فن پر مقالہ لکھا۔

اختر ہوشیار پوری نے باقی صدیقی کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔

سید فیضی نے دو قطعات تحریر کئے جو فارسی زبان میں ہیں۔

سید علی عباد نیساں اکبر آبادی نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔

مختار صدیقی نے سر آغاز کے عنوان سے زخم بہار کا پیش لفظ لکھا۔

رشید نثار نے "کتنی دیر چراغ کے" عنوان سے باقی صدیقی کو خراج پیش کیا۔

احمد ندیم قاسمی نے باقی صدیقی کے نعتیہ مجموعہ کلام کا تعارف لکھا۔

رائے منصب علی خان نے کچے گھڑے پر لکھا۔

منیر احمد شیخ نے باقی صدیقی کی پنجابی پوٹھوہاری شاعری کے حوالے سے لکھا۔

پروفیسر جمیل ملک نے دارورسن پر مقالہ لکھا۔

ملک کے معروف شاعر اور ادیب جمیل یوسف نے باقی صدیقی پر مقالہ لکھا جو اوراق میں چھپا تھا۔

جسٹس شیخ انوارالحق نے باقی صدیقی کی عظیم شاعرانہ خصوصیت کو سراہا۔

بیگم شفیقہ ضیاالحق نے باقی صدیقی کے جلائے ہوئے چراغ کو زندہ رکھنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔

کوثر نیازی نے باقی صدیقی کی شاعری کو کرب کا ٹھہرا ہوا سمندر کہا۔

یونیورسٹی آف دی پنجاب نے ملک کے نامور محقق، افسانہ نگار نقاد اور ادیب پروفیسر حامد بیگ مرزا کو باقی صدیقی پر پی ایچ ڈی کے لئے Thesis لکھنے کے لئے کہا تھا۔ انہوں نے اپنا Thesis مکمل کر لیا تو یونیورسٹی نے باقی صدیقی کو پی ایچ ڈی کی سطح کا شاعر نہ سمجھتے ہوئے فہرست ہی سے خارج کر دیا۔

پنجابی ادبی سنگت، پنڈی ادبی سوسائٹی اور راولپنڈی اسلام آباد کی دیگر علمی ادبی انجمنیں اور اہم شخصیات ہر سال 8 جنوری کو فاتحہ خوانی کے لیے سہام پہنچتی ہیں اور باقی صدیقی کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے اسکے علاوہ ہر سال انکی یاد میں مشاعرہ یا کوئی جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔

زندگی حرف غلط ہی نکلی
ہم نے معنی تو بہت پہنائے
(باقی صدیقی)

باقی صدیقی فوج میں
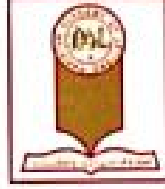
پاکستان نے ادب کے میدان میں نابغہ روزگار شخصیات پیدا کی ہیں ان بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا ہم پر کم سے کم یہ حق ہے کہ ہم ان کے کارہائے نمایاں اپنی آئندہ نسلوں تک بلا کم و کاست پہنچانے کے لیے اقدامات کریں اس مقصد کے پیش نظر ان ادباء پر الگ الگ کتابیں شائع کی جا رہی ہیں تاکہ شائقین علم و ادب، محقق اور طالب علم اس ادبی شخصیت کے بارے میں محض ایک ہی کتاب کی ورق گردانی کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کر سکیں۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ISBN:969-472-140-7